ہمارا ادب

شخصیات نمبر



ہمارا ادب

(شخصیات نمبر ۵)

۱۹۸۹ء

نگران

محمد یوسف ٹینگ

ترتیب

محمد احمد اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ناشر:- سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

مطبع:- فوٹو لیتھو ورکس - دہلی

کتابت:- معراج الدین - غلام نبی کول

تعداد: ۵۰۰

قیمت:-

٥ - مقالہ نگاروں کی آرا سے اکادمی یا ادارے کا
کلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں - ٥

سرورق
عمل: مسعود حسین

ترتیب

پیش لفظ

"شخصیات نمبر" کی پانچویں جلد پیش خدمت ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ ضرور محسوس کریں گے کہ اس جلد میں بھی ایسی شخصیات کو ہی جگہ ملی ہے جنہوں نے اس ریاست، یہاں کے عوام، ادب، علوم و فنون اور ثقافت کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے۔ یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ اس کارواں میں اتنے اور ایسے نام ہیں کہ سب کو ایک جلد میں پیش کرنا آسان نہ تھا، اس لئے پہلی جلد ترتیب دیتے وقت ہی یہ طے پایا کہ یہ سلسلہ چند سال جاری رہے اور اسے کئی جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

مضامین کے حصول کے سلسلے میں اگر حق گوئی سے کام لیا جائے تو ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مقدور بھر کوشش کے باوجود ہمیں ریاست کی تینوں اکائیوں سے بہت کم شخصیات پر مضامین موصول ہوئے اور اپنے کئی ہم عصر قلمکاروں سے خاطر خواہ تعاون نہیں ملا۔ چند دوستوں نے مضمون لکھنے کی حامی بھر لی، کچھ نے قبولیت نامے تک ارسال کئے لیکن ہمارے مسلسل تقاضوں کے باوجود مضامین ارسال نہیں کئے۔ چنانچہ مجبوراً ہمیں کئی حضرات سے دو سے زائد مضامین بھی لکھوانے پڑے تاکہ یہ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آپ تک پہنچ سکے۔ یہی حال تصاویر کی فراہمی کے سلسلے میں بھی رہا۔

بہر حال شخصیات نمبر کے سلسلے میں اگر ہمیں، جیسے کہ اس سے قبل ہوتا رہا، مضامین موصول نہیں ہوئے تو یہ اس سلسلے کی آخری جلد ہوگی۔ اُمید ہے کہ قارئین اس جلد کے بارے میں بھی ہمیں اپنی قیمتی آراء سے مستفید فرمائیں گے۔

○ —— محمد احمد اندرابی

موتی لال ساقی

بھگوان گوپی ناتھ

میرے بھائی تم پوچھتے ہو
انسان کب تکمیل کو پہنچے گا

میرا جواب ہے
منش تب تکمیل کی حدود کو چھوتا ہے
جب وہ محسوس کرے کہ وہ لامحدود کائنات
اور ایک بیکراں سمندر ہے ـــــ
ایک ابدی آگ، ایک نہ بجھنے والی روشنی ہے
خاموش پون ـــــ
یا ایک اُمنڈتے ہوئے طوفان کی گھن گرج ہے
برسات کی سہاونی رُت
ایک نغمہ سنج آبشار،
ایک جوئے کم آب ہے

بسنت رُت میں پھولوں سے لدی جھاڑی
خزاں کا ایک ٹنڈ منڈ درخت
آسماں سے سرگوشیاں کرتا پہاڑ
یا ایک ڈھلوان وادی
ایک زرخیز میدان
یا ایک ریگستان ہے"
"کیا تکمیل اُس انسان کی قسمت ہے
جس کے پاس جاہ و ثروت ہے
دولت اور اِقتدار ہے
جو لاکھوں کا حُکمران ہے
اور
جس کے پاس پھٹکنے سے لوگ لرز اُٹھتے ہیں"
یہ سب کچھ پاکر کیا اُسے من کا سکون مِلتا ہے
نہیں ۔
تکمیل راز ہے اپنے آپ کو پانے کا
عرفانِ ذات کا
من و تو کے حصار سے نکل کر بلندیوں پر پرواز تکمیل کا زینہ ہے
وہاں دوئی پر نہیں مار سکتی
وہاں پر تو محبت ہی راہ بھی ہے اور منزل بھی"

خلیل جبران ——٥

جو لوگ تکمیل کو پاتے ہیں اُن کے سامنے نام و نمود بے معنی

ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا جینا اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہوتا ہے۔ یہ لوگ ذات کے دھیان سے اُوپر اُٹھ کر سراپا عجز، انکسار اور خیر کی علامت ہوتے ہیں۔ آتم گیان سے آراستہ جیون مکت لوگ تیجسوی بن جاتے ہیں اور اپنے تیج، اپنے نُور سے راستوں کو دُور دُور تک منوّر کر دیتے ہیں۔ دِل و ذہن کے اندھیروں کو ضیا پاش کر دیتے ہیں۔ جاہ و حشمت، شہرت اور اقتدار، دولت اور شہرت ــــ کوئی رغبت نہیں ہوتی ہے اِن چیزوں سے۔ ایسے لوگوں کو ــــ پھر بھی یہ چیزیں اُن کے قدموں پر لوٹتی ہیں۔ مگر بے سُود ــــ کیوں کہ یہ سب کچھ اِن لوگوں کے لئے محض راکھ کا ڈھیر ہوتی ہیں۔

بودھ دھرم میں ایسے لوگوں کو بودھ ستو کہا گیا ہے جو لوگوں کی بھلائی کے لئے جیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دربار میں بددماغ بدمزاج اور مغرور اور جابر حکمران جو دُنیا کو اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اِن سراپا منکسر المزاج لوگوں کے حضور غرور اور گھمنڈ کا کوئی گزر نہیں۔

ایسے مہاپُرشوں کے سامنے وقت تھم کے ایک مکمل اکائی بن جاتا ہے۔ وقت ــــ ماضی، حال اور مُستقبل۔ اِس فرضی تقسیم کا بندھن ان عظیم لوگوں کو چھوتا تک نہیں۔ اُن کی بینا نظریں زماں و مکاں کی سرحدوں کو چیر کر سب کچھ اپنے سامنے محو رقص دیکھتی ہیں۔ اِن لوگوں کی چھٹی حِس (ششٹی کلا) جب بیدار ہو جاتی ہے تو چمتکاروں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ جو واقعہ سینکڑوں سال پہلے رونما ہُوا ہو اُس واقعے کو یہ لوگ اپنی نظر کے سامنے ہوتے دیکھتے ہیں اور جو کچھ سینکڑوں برس بعد

ہونے والا ہو اُس کا بیان کرنے میں ایسے لوگوں کو کوئی دِقت نہیں ہوتی۔ یوگیوں کی زبان میں اس اوستا کو ترکال درشٹی کہا گیا ہے۔

بھگوان گوپی ناتھ ایک ایسے ہی مہا یوگی تھے جنہوں نے زماں و مکاں کی قیود کو سر کر کے ترکال درشٹی کی پدوی پالی تھی۔ اُنکے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، جو کچھ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جسکا لوگوں کو ذاتی تجربہ ہے وہ حقیقت سے زیادہ ایک طلسماتی کرشمہ لگتا ہے اور ہماری محدود عقل دُوری تک رہنمائی نہیں کرتی۔ پھر بھی یہ ایک ایسا کھرا سچ ہے جس کے چشم دید گواہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ بھگوان گوپی ناتھ کو پرلوک سدھارے اب بیس[۲] برس ہو چکے ہیں مگر اُن کے معتقد، اُن کے چاہنے والے آج بھی اُن کو اپنے درمیان یہاں وہاں اور ہر جگہ پاتے ہیں۔ سمندروں سے پار آسٹریلیا میں بھی وہ لوگ اُن کے درشن کرتے ہیں جنہوں نے اُنہیں کبھی دیکھا نہیں ہے۔ کسی معتقد پر کوئی بپتا آئے تو گرہ کشائی کیلئے وہ خود حاضر ہو جاتے ہیں۔ ماورائی شعور سے آراستہ گوپی ناتھ جی ایک ایسا مینارِ نور تھے جس کی روشنی نے ذرّے ذرّے کو احساسِ حق سے سرشار کر دیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں وہ اپنی بہن دیوکی اور چند بھگتوں کے ساتھ امرناتھ یاترا کو گئے۔ اس قافلے میں شری نارائن جو ہنڈو، پربھاوتی ہنڈو، اُن کا دس سالہ لڑکا موتی لال، بھولا ناتھ ہنڈو وغیرہ بھی شامل تھے۔ داوجن سے جب یہ لوگ چلے تو قافلہ دو ٹولیوں میں بٹ گیا۔ خواتین کو آگے بھیجا گیا اور مرد اُن کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ عورتوں کی ٹولی



بھگوان گوپی ناتھ

جب دیکھتی تو بھگوان گوپی ناتھ جی اُن کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور جب مرد نظر دوڑاتے تھے تو وہ اُن کو اپنے ساتھ ساتھ چلتے دِکھائی دیتے تھے مگر حقیقت میں وہ کسی دوسری جگہ آرام فرما رہے تھے۔ کاروال کے ساتھ اُن کے بھگت شری بھولا ناتھ نے جب اُنکو جگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اُس سے کہا: "تم نے یہ کیا کیا؟ کیا تم نہیں دیکھتے ہمارا آس پاس جُھلس رہا ہے۔ میں تو اس علاقے کو پانی دینا چاہتا تھا"۔ بھولا ناتھ نے جواب دیا: "مگر مہاراج بارش ہوگی تو کھٹنائی کا سامنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی چھت آکھڑی ہو" بھگوان جی نے اُسے بتا دیا کہ قافلے کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اُس کے بعد ہُوا یہ کہ بھگوان جی کا قافلہ آگے دھوپ میں نہاتا جارہا تھا اور پیچھے بارش ہورہی تھی۔

امرناتھ یاترا سے لوٹنے کے ایک ہفتے بعد بھگوان گوپی ناتھ جی اور ہنڈو گھرانے کے ارکان نے گوتم ناگ (اننت ناگ) کی یاترا کرنے کا فیصلہ کیا۔ گوتم ناگ وِشنو استھاپن ہے اس لئے یہاں پر وشنوی کھانا ہی کھایا جاتا ہے۔ مگر بھگوان جی کے کہنے پر ہنڈو گھرانے کے ارکان بھات کے علاوہ پکائی گئی مچھلیاں بھی ساتھ لے گئے۔ ابھی یاتری کھانا ہی کھا رہے تھے کہ یاترا کا مہنت سوامی گاشہ کاک آگیا اور بھگوان جی سے کہا کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ یہ وشنوی استھاپن ہے پھر کیوں آپ نے یہاں مچھلیاں کھائیں۔ بھگوان جی نہایت متانت کے ساتھ سوامی گاشہ کاک جی سے بولے: "کس نے کھائی ہیں مچھلیاں؟ اگر تم چاہتے ہو وہ مچھلیاں تمہیں واپس مل جائیں تو حاضر

ہیں"۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے دو اُنگلیاں منہ میں ڈالدیں اور دو زندہ مچھلیاں اُگل دیں جو اُچھل کر چشمے میں چلی گئیں۔ سوامی گاشہ کاک نے جب یہ منظر دیکھا تو زبردست شرمندہ ہو گئے اور بھگوان جی سے معافی مانگی۔"

"۱۹۴۸ء میں بھگوان گوپی ناتھ جی اپنے سیوکوں کے ساتھ ڈونگے میں نشاط کی سیر کے لئے گئے۔ وہ لوگ اپنے لئے سوکھی مچھلیاں (ہوگاڈ) لے گئے تھے تاکہ ضیافت کے طور پر اُن کو پکایا جائے۔ بھگوان جی نے ایک سوکھی مچھلی اُٹھائی اور کچھ دیر تک اسے اپنی گود میں سہلایا، اس کے بعد اسے ڈل میں ڈالدیا۔ جونہی سوکھی مچھلی نے پانی کی سطح کو چھولیا اُس میں جان آگئی اور پانی میں تیرنے لگی۔"

بھگوان گوپی ناتھ جی ذات پات اور کھان پان میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے تمام انسان بھگوان کا رُوپ تھے۔ شُدھی تو من کی ہونی چاہیئے، تن کا میل دُھلنے سے بات نہیں بنتی۔ بات بنتی ہے تو من کا میل دُھلنے سے۔ ایک بار اُن کے ایک سیوک شُبن جی ترکی نے اُن سے کہا: "مہاراج میری نوکری ایسی ہے کہ مجھے جہاں جو ملے وہ کھانا پڑتا ہے، اور میں اس بارے میں احتیاط سے کام نہیں کر پاتا۔" اُنہوں نے اطمینان سے جواب دیا: "کیا ہندو ایک ہے اور مُسلمان میں ایک؟" باتیں چونکہ وہ بہت کم کرتے تھے اسلئے سمجھنے والے اُن کی بات کے معنی خود بخود سمجھ گئے۔

زینہ دار محلہ کے نیلہ بب اکثر بھگوان جی کے پاس آیا کرتے تھے اور کھان پان کے معاملے میں بڑے کٹر تھے۔ ایک بار ایک عورت اُن کے لئے کھانا لیکے آئی۔ نیلہ بب بھی اُس وقت بھگوان جی کے

پاس بیٹھے تھے۔ بھگوان جی کھانا ایک چادر پر رکھواتے۔ اس میں سے تھوڑا سا خود کھاتے اور باقی حصّہ پرشاد کے طور پر حاضرین میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس بار انہوں نے کھانا سیدھے فرش پر رکھوالیا۔ نیلہ بب کو جب پرشاد دیا گیا تو اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر بھگوان جی نے سارا کھانا خود ہی کھالیا۔ اسطرح اُنہوں نے نیلہ بب پر یہ بات آشکار کر دی کہ ظاہر داری کی راہِ حق میں کوئی اہمیت نہیں۔ مشہور یوگی مہاتما لچھہ کاک نے آج سے ایک سو بیس سال پہلے کہا ہے:

زِپوٗ ییلہ گژھہِ آتمس لین سُے زیٖو اد ایشر

(منش جب آتما میں لین ہو جاتا ہے۔ وہی جیو، وہی منش پھر پرماتما سروپ ہو جاتا ہے)

بھگوان گوپی ناتھ بلا شبہ وہ خود شناس اور خود آگاہ یوگی تھے جنہوں نے پرم شِو تک رسائی حاصل کی تھی خود شناسی اور خود آگہی نے اُن کو رُوحانی طاقت کا ایک وشال سمندر بنا یا تھا۔ ایک ایسا وشال سمندر جس میں غوطہ زن ہو کر ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق موتی چُن لیتا تھا۔

۱۹۶۲ء میں بھگوان گوپی ناتھ جی بھدر کالی استھاپن ہندواڑہ کی یاترا کے لئے پدھارے۔ اُن کے بہت سارے شِشں اس یاترا میں اُن کے ساتھ تھے۔ یاترا کرنے کے بعد اُنہوں نے کچھ وقت کے لئے وہاں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اپنے سیوکوں کو تاکید کی کہ وہ واپس گھر چلے جائیں سیوکوں نے ایسا کیا کہ وہ بغیر اُنکے

حضور میں رہیں گے مگر بھگوان جی نے انہیں کہا "مشرق کی طرف سے
زبردست آندھی اُٹھنے والی ہے اور یہ آندھی تم لوگوں کو اُڑا لے جائیگی،
اس لئے تم لوگ واپس چلے جاؤ۔" سیوک تو اُن کی زبان، اُن کی بشارت
کو معنی پہنا نہیں سکے مگر حکم کی تعمیل کرنے میں وہ عذر بھی نہیں کرسکے۔
اس واقعے کے چند دن بعد ہی چین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

اس نوع کے واقعات اور چمتکاروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے
کہ ایک مضمون میں اُن کو سمویا نہیں جاسکتا۔ اس لئے اختصار سے کام
لینا ہی مناسب رہے گا۔

بھگوان جی کے نورِ عرفان سے اُن کے انتردھیان ہونے کے
بعد بھی لوگ منور ہوتے رہے۔ اس بارے میں شری ایچ این کول کے
ذاتی تجربے کا بیان مناسب رہے گا۔ اپنے کتابچے "India in Indian or
Mystic East" میں آپ نے لکھا ہے:-

"ڈاکٹروں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ کلیجے کی صلاحیت
ختم ہوجانے کی وجہ سے میں شراب پینا کم کردوں ورنہ کلیجہ
غذا کو ہضم کرنے میں ساتھ نہیں دے سکتا۔ زندگی کی تمام
اچھی چیزوں کی طرح میں نے اُن کا یہ مشورہ سنا اَن سُنا کردیا
اور شدید بیمار ہوگیا۔ کلیجے کی تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی مگر
درد برداشت سے باہر تھا۔ میں نے پتھیا ڈین کے گھونٹ
اور میندرکس کی گولیاں کھا کر زندہ رہنا شروع کردیا مگر یہ
سارا بھی عارضی نوعیت کا تھا۔ صحت یاب ہونے کے آثار
نظر نہیں آرہے تھے۔ میری ہمت بھی انتشار کا شکار تھی۔

میرے درد سے مُتاثر ہو کے بیوی نے مجھ سے متبرک بھبوتی کی ایک چٹکی نگلوانے کی جان توڑ کوشش کی جس کا اُس کے پاس اچھا خاصا بھنڈار تھا مگر ایک اور میرے عقیدے کی پختگی اور دوسری اور بیوی کا عقیدہ۔ پھر بھی میں جیسے تیسے اُس کی تجویز پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اُدھر میں درد سے تڑپ رہا تھا مگر حوصلے کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

سگریٹ کے احتیاج نے مجھے بیقرار کر دیا تھا اور میں نے صرف ایک کش لینے کے لئے بیوی کی منت سماجت کی۔ ڈاکٹروں نے چونکہ مجھے سگریٹ سے باز رہنے کی تاکید کی تھی اور میں اس امر سے باخبر تھا کہ میری بیوی سگریٹ اور شراب کو میرے لئے زہر مانتی ہے۔ مگر اُس وقت میری حیرانگی کی کوئی حد نہیں رہی جب اُس نے چارمینار سگریٹ کا ایک ٹکڑا لا کے دیا جو کہ اُس نے اپنے پرس کی گرہوں کو ٹٹول کر حاصل کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو میں سگریٹ کے ٹکڑے پینے کا عادی ہوں اور نہ ہی چارمینار میرا من پسند برانڈ ہے مگر ایک ہفتے سے سگریٹ کا کش نہ لینے کی وجہ سے میں نے چارمینار کے بٹ کو قبول کیا۔ بیوی کی فراخدلی کی داد دیتے ہوئے میں نے شدّت طلب کے نتیجے میں بٹ پینا شروع کر دیا۔ سگریٹ کا کش لیتے ہی اطمینان کی ایک لہر سی

میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ فرحت، تشفی اور سکون نے
میرے روم روم کو سرشار کر دیا۔ میں نے ایک بادشاہ کی
طرح اپنے آپ کو صحت مند، شادماں اور ہلکا محسوس کیا۔
پانچ دِن شدید درد وکرب کے سمندر میں ڈوبنے اور اُبھرنے
کے بعد میں گہری نیند سو گیا اور جب میں بیدار ہُوا تو بیوی
نے موت کے پنجوں سے چُھڑانے کے اِس کرشمہ کو ہِرا کسٹریکٹ
اور ٹیرامان سین کی اُن سینکڑوں گولیوں کے بدلے بھگوان جی
کی کرپا اور دیا کا نتیجہ قرار دیا۔ بھگوان جی جو اُس کے 'پوجیہ'
اُس کے 'دیوتا تھے'۔

دولت پرستی اور نفسانفسی کے آج کے دور میں ایسی باتیں
عجیب سی ضرور لگتی ہیں کیونکہ انسان نے کم وبیش اپنے اندر جھانکنے کی
صلاحیت کو کھو دیا ہے۔ وہ خارجی دُنیا کو ٹٹولنے اور پانے میں اِسقدر
ڈوب گیا ہے کہ عرفان اور آگہی کی کامنا بھی اُس کے من سے جاتی رہی
ہے مگر کبھی کبھی واقعات اِسقدر انہونے ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا اپنے
واقعات کو سحر سے بھی پُر اسرار گرداننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اِنسان
کی عقل ایسے مقامات پر چکمہ کھا جاتی ہے۔ حق تو یہ ہے ماوراتک
رسائی حاصل کرنے میں عقل زیادہ دُور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔

موت کا دِن معین ہونے کے باوصف بھی بے شمار لوگ ایسے
ہیں جنکو یہ معلوم نہیں کہ اُن کی موت کا دن کونسا ہے۔ سائنس کی بے
پناہ ترقی کے باوجود بھی ہمارے سائنسدان ابھی تک موت کی گُتھی کو
سُلجھا نہیں سکے ہیں مگر ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی سعادت

مجھے حاصل رہی ہے جنہوں نے انتر دھیان ہونے سے مہینوں کیا سالوں
پہلے کہہ رکھا تھا کہ ہم کو دُنیا چھوڑ کر جانا ہے اور ہم فُلاں تاریخ کو کوچ
کرنے والے ہیں۔ خیر۔ بھگوان جی ایک ایسے ہی مہا پُرش تھے جنہوں نے
کال پر قابُو پالیا تھا اور اس بات سے آگاہ تھے کہ کب کس کو اس مادی
دنیا سے خالی ہاتھ واپس جانا ہے۔

بھگوان گوپی ناتھ کے ایک سیوک شری کنٹھ جُو لیشن اُن کے پاس
اکثر آیا جایا کرتے تھے اور پھر ایک دن یکایک بیمار ہو گئے۔ کنٹھ جُو نے
اپنے ایک آدمی کو بھگوان جی کے پاس اس گزارش کے ساتھ بھیجا کہ
میں جانتا ہوں کہ میرا انتم سمے آچکا ہے مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ
میں کس دن اور کس وقت اپنے پرانوں کا تیاگ کروں گا۔ سندیشہ لانے
والے کی بات سُن کر بھگوان جی نے کنٹھ جُو کو سندیشہ بھیجا کہ تم اگلے
بُدھ کو ٹھیک چار بجے شام کو پرانوں کا تیاگ کرو گے۔ اُس کے بعد
ٹھیک اُسی دن مُقرّرہ وقت پر کنٹھ جُو پشن پر لوک سدھارے۔

وِدوچھ وۆ نمتےٗ
وُدِلو ونہِ اۆ نمتےٗ
بُدھانش ژھیٚو نمتےٗ
سہز وِچار کرُن

(جاننے والوں نے کہا ہے:
جو لوگ بیدار ہیں اُنھوں نے پہچان لیا ہے
عقل سے تو ماورا ہے
سہج[۲] وچار کرنا۔)

چہرے بشرے سے بھگوان گوپی ناتھ دور متوسط کے کشمیری
پنڈت لگتے تھے۔ لمبا پھیرن اور سر پر ڈوگرہ طرز کی پگڑی عمر بھر اُن کی
پوشاک کا حصہ رہی۔ اُن کا چہرہ خربوزے کی طرح لمبا تھا اور بھوؤں
کے درمیان نمایاں ٹیکہ دُور سے ہی اُن کے آتم گیان ہونے کی بشارت
دیتا ہے۔ اُن کے گلے میں رودراکش کی مالا لٹکی رہتی تھی۔ باتیں تو وہ
بہت کم کرتے تھے اور جو بھی بات کرتے تھے وہ گنجینۂ اسرار سے
کم نہیں ہوتی تھی۔ جہاں پر بھی وہ بیٹھتے اُن کے سامنے دھونی جلتی
رہتی تھی۔ اُن کی باتیں اکثر تمثیلوں میں ہوتی تھیں اور اُن کو معنی پہنانا
ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ دھونی کے ساتھ ہی وہ ایک سیگڑی
بھی رکھا کرتے تھے اور چلم سلگا کر کش پر کش لیتے رہتے تھے۔ بھری
محفل میں بھی وہ سمادھی میں مگن رہتے تھے اور جب آنکھیں کھولتے
تھے تو اُن سے ایک مخصوص قسم کی روشنی یا چمک پھوٹ پڑتی تھی۔ زندگی
بھر اُنہوں نے مختلف دیو استھانوں کی یاترا کی مگر آخری ایام میں اُنہوں
نے اِدھر اُدھر جانا بلکل ترک کر دیا تھا۔ اپنے پیچھے ٹیک لگانے کیلئے
وہ دو فٹ اونچا تکیہ رکھتے تھے اور اسی طرح کا ایک تکیہ اُنکے دائیں
اور ہوتا تھا۔ سامنے سیگڑی اور دھونی کا دوسرا سامان ہوتا تھا۔ اسطرح
وہ صرف بائیں اور پاؤں پسار سکتے تھے۔ مگر مہانروان سے دو سال
پہلے انہوں نے بائیں اور بھی ایک تکیہ رکھا تھا جس کے نتیجے میں پیر
پسارنے یا لیٹنے کے لئے اُنہوں نے کوئی جگہ نہیں رکھ چھوڑی تھی۔ چنانچہ
ایک ہی جگہ جم کر بیٹھنے کی وجہ سے اُن کے گھٹنوں اور ٹخنوں میں
ٹیڑھاپن آگیا تھا۔ دراصل اُنہوں نے اپنے آپ کو آسن کے ساتھ

ایک طرح سے باندھ کے رکھ دیا تھا۔

بھگوان گوپی ناتھ جی ۲۸ مئی ۱۹۶۸ء کو شام کے پانچ بجکر ۴۵ منٹ پر مہاسمادھی میں سما گئے۔ اس دن جیشٹھ شکلہ پکھش کا دوسرا دن تھا۔ دیہانت کے دن کا حال اُن کے سوانح نگار پنڈت شنکر ناتھ فوطیدار نے اس طرح لکھا ہے:-

اُس دن صبح کو اُنہوں نے سدا کی طرح منہ دھویا، صافہ باندھا، تلک لگایا اور اپنی بائیں اور جھکے رہے۔ کچھ لوگ اُنکے درشنوں کے لئے آئے تھے۔ جو لوگ اُن کے درشنوں کے لئے آ گئے تھے اُن کی تعداد کا پورا اندازہ نہیں۔ لگ بھگ شام کے تین بجے تین سادھو آئے۔ بھگوان جی نے اپنی کپڑے کی تھیلی وہاں پر بیٹھے اپنے ایک بھگت کی اور پھینکی اور اس سے کہا کہ ہر سادھو کو ایک ایک روپیہ دیا جائے۔ سادھوں کو روپیہ دیا گیا۔ اُس کے بعد اُنہوں نے چلم پھونکی مگر کش لینے میں انہیں کھٹنائی ہو رہی تھی۔ ایک بھگت بدری ناتھ کول کھوڈہ اُن کے لئے چائے بنانے لگے مگر بھگوان جی نے اُس سے کہا کہ اب ہم کوئی چائے نہیں لیں گے۔ اُس کے بعد وہ ساڑھے پانچ بجے شام تک سمادھی میں رہے۔ سمادھی کے بعد اُنہوں نے پانی مانگا۔ انہیں ایک گلاس شربت پلایا گیا۔ پانچ بجکر ۴۵ منٹ پر انہوں نے آہستہ سے "اوم نمہ شواے" پڑھا اور گہری نظر سے چاروں اور دیکھا۔ اُس کے بعد اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور سب

کچھ سماپت ہو گیا" ٭

دہکتی آگ میں تپ کر ہی سونا کُندن بن جاتا ہے اور زِندگی کی کھٹنائیوں سے نبرد آزما ہو کر ہی اِنسان کی شخصیّت نِکھرتی ہے۔ بھگوان گوپی ناتھ نے جگت سنگرام کا سامنا کر کے اپنے آپ کو پالیا اور رُوحانیت کی بُلندیوں پر جاگزیں ہو گئے۔ سفر چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مُشکلات اور مصیبتوں سے چھٹکارا نہیں مِل پاتا۔ بھگوان جی نے زِندگی سے بھاگ کر نہیں بلکہ زِندہ رہ کر اپنے فرائض کو نبھا کر ہی دُنیا کو تیاگ دیا تھا۔ وہ زِندگی سے بھاگنے کے طرفدار نہیں تھے۔ اُن کا تو قول تھا کہ زِندہ رہ کر، جی کر ہی اِنسان بلندیوں کو چھُو سکتا ہے۔ وہ کہا کرتے:

"وہ شخص بہادری کے ساتھ مایا کے سمندر کو پار کر سکتا ہے جو اگرچہ ظاہری طور پر دُنیا سے وابستہ ہو مگر داخلی طور پر تمام دُنیاوی خواہشات اور تعلقات کو تیاگ چُکا ہو۔"

بھگوان جی باتیں بہت کم کرتے تھے۔ اِس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے مگر اُن کے چپ سادھنے کے پیچھے بھی ایک بہت بڑا راز پوشیدہ تھا۔ اُن کا یوگ، اُن کا طرزِ عمل ایک غور و فکر کرنے والے مہارشی کا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ رِشیوں کے اُس زمرے میں آتے ہیں جنہیں ویدوں میں مُنی کہا جاتا ہے۔ ایسے رِشی غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر بیش بہا موتی پا لیتے ہیں۔ غور و فکر کی کیا قدر و قیمت ہے اسکے بارے میں آپ کا اِرشاد تھا:

٭ بھگوان گوپی ناتھ جی — از شنکر ناتھ فوطیدار ص ۸۷

"یوگی حق تک رسائی کرے تو کرے مگر وچار کرنے
والا برہما کے تمام تر پہلوؤں کی جانکاری حاصل کرسکتا ہے۔
وچار کرنے سے فرد کی ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا
ہے اور وہ سوکھشم وچار (ماورائی ادراک) کی لہروں سے
لیس ہوجاتا ہے۔ یہ لہریں اُس کے اندر نئے خیالات کو
جنم دیتی ہیں جو کہ چد آنند میں بسے رہتے ہیں (وِچار
دھارائیں مرتی نہیں امر ہیں)۔ فرد کے تمام تر وِچار اُس
آفاقی قوت کے ساتھ ایک ہوجاتے ہیں جو قوت مختلف
رُوپ دھار کر برہمانڈ میں جاری و ساری ہے۔ ایک جیسے
وِچار آپس میں گھُل مل جاتے ہیں۔ وِچاروں کی نوعیت جو
بھی ہو، چاہے وِچار اچھے ہوں یا بُرے، یہ ایک زبردست
قوت کے محرک ہوتے ہیں۔"

شکتی اُپاسک گوپی ناتھ جی کے جسم سے دِن رات ایک
طرح کی برقی لہریں خارج ہوتی رہتی تھیں اور جو کوئی بھی اُنکے آشرم
میں جاتا تھا وہ ان برقی لہروں کی قوت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا
تھا۔ درشن کے لئے آنے والوں پر وہاں ایک خود فراموشی کا عالم طاری
ہوجاتا تھا اور وہ اپنے اندر ایک تازگی کا احساس لے کر واپس جاتے
تھے۔ تمام سنتوں اور صوفیوں کی طرح وہ بھی سنگیت کے رسیا تھے۔
ہر اتوار کو اُن کے آشرم میں گاین وادن کا اہتمام ہوتا تھا۔ اِبتدائی دور
میں وہ صرف گورو گیتا اور لل دید کے واکھیہ سُننے اور سُنانے پر اکتفا
کرتے تھے مگر بعد میں وہ ہر طرح کے گاین وادن سے لُطف اندوز

ہوتے تھے مگر مہا سمادھی سے کچھ عرصہ قبل اُنھوں نے سنگیت کیساتھ
رغبت کو بھی تیاگ دیا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ اب اس کی ضرورت نہیں
رہی۔ دِن رات منتروں کا وادیا اُچارن کرنے والے گوپی ناتھ جی کے
بارے میں یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ وہ کونسے منتروں کا ورد کرتے۔ اُن کا
گورو کون تھا؟ ہاں صرف اندازے کئے گئے ہیں۔ البتہ اُنھوں نے خود
کہا ہے کہ گیتا ہی میری گورو ہے۔

گوپی ناتھ جی نے اگرچہ رسمی تعلیم صرف مِڈل تک حاصل کی تھی
مگر وہ سنسکرت کی بھی خاصی جانکاری رکھتے تھے۔ ہندی کے علاوہ وہ
اُردو اور فارسی زبانیں بھی جانتے تھے اور کبھی کبھی خاصی انگریزی بھی بول
لیتے تھے جو اُن کی انگریزی سے واقفیت کا بیّن ثبوت تھا۔ سنسکرت کی
اکثر دھارمک کویتائیں، منتر اور شلوک اُن کو زبانی یاد تھے مگر جب وہ
سادھنا اور تپسیا کی منزل کو پھاند کر آگے نکل گئے اُس کے بعد کسی
نے بھی انہیں کوئی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا۔

بھگوان گوپی ناتھ جی کا جنم ۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو سرینگر کے
بھانہ محلہ میں ہُوا تھا۔ آپ کے والد بزرگوار پنڈت نراین جُو بھان ایک
خُداترس شخص تھے۔ سکول جانے کے دوران آپ اپنے آبائی گھر میں
اپنے والدین کے ساتھ رہے مگر اسی دوران اُن کے گھرانے کو مُصیبت نے
آگھیرا اور وہ اپنی آبائی وراثت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ چنانچہ اُن کو کرایہ
کے مکان میں رہ کر گھر گھر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ زمانے کے پھیر بدل
سے کِس طرح کایا پلٹ ہو جاتی ہے اُس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ
بھگوان جی کے دادا پنڈت لکشمن جُو بھان اپنے زمانے میں وزیر وزارت

کے عہدے پر فائز تھے اور زمانے کے ایک کرتب نے اُن کے پریوار کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ بھگوان جی کے والد پشمینے اور اُون کا کاروبار کرتے تھے مگر اپنا زیادہ تر وقت پُوجا اور سادھنا میں صرف کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی ساری جائیداد سوتیلی ماں کو سونپ کر خود کرایہ کے مکان میں رہنا قبول کیا۔ بھگوان جی کی ماتا کا نام "ہارِمال" تھا جو اُن کے پتا کی طرح یادِ حق اور دھرم و کرم کے کاموں میں لگی رہتی تھی۔ اُس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ منش رُوپ میں بھگوتی راگنیا کا رُوپ تھی۔

کہاوت ہے کہ مُصیبت آتی ہے تو ٹوٹ کر آتی ہے۔ گھر سے بے گھر ہو کر آپ کے والدین نے حبہ کدل میں نگریوں کے گھر میں بسیرا کیا اور یہیں پر اُن کی ماتا ہارِمال کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد وہ بودھ گیر میں بھانوں کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہاں سے اُنکے ماما جی پنڈت بشمبر داس اُن کو اپنے گھر سیکہِ ڈافر صفا کدل لے گئے۔ ۱۹۱۰ء کے آس پاس جب بھگوان جی کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے آس پاس تھی، اُنہوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ گھریلو حالات نے انہیں پڑھائی جاری رکھنے سے باز رکھا اور وہ تلاش معاش کرنے لگے۔ تلاش کے دوران اُن کو وبشناتھ پریس فتح کدل (سرینگر) میں نوکری مل گئی (یہ پریس اب ریزیڈنسی روڈ پر واقع ہے)۔ یہاں پر وہ کمپوزٹر کا کام کرتے تھے۔ مگر پریس نوکری انہیں راس نہیں آئی اور وہ ایک طرح کے اضطراب میں مبتلا ہو گئے۔ بعد میں اُن کو مرکنٹایل پریس والوں نے بھی مُلازمت دینے کی پیشکش کی۔ جو اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اُنہوں نے کمپوزنگ کی خاصی

مہارت حاصل کی تھی۔ مرکنٹایل پریس کی پیشکش کو اُنھوں نے نہ جلنے کیوں ٹھکرادیا۔ شاید اِسلئے کہ وہ کسی اور چیز کی تلاش میں تھے۔ اُنہیں پیسے سے زیادہ خود آگہی کی آرزو تھی۔ حالانکہ نامساعد گھریلو حالات، مالی مشکلات اور دیگر امور نے اُنہیں کافی پریشان کر رکھا تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے مصائب کا جی جان سے مُقابلہ کیا۔ بُنیادی طور پر وہ اس زمانے میں بھی اپنے رُوحانی سفر کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ عرفانِ ذات کی جستجو میں اُنھوں نے پریس کی نوکری کو خیر باد کہا اور سیکہ ڈافر میں کِریانہ کی ایک چھوٹی موٹی دوکان کرنے لگے۔ دوکانداری میں انہیں یادِ حق کرنے کا زیادہ موقعہ ملتا تھا اس لئے اُنھوں نے پریس کی نوکری پر دوکانداری کو ترجیح دی۔ سیکہ ڈافر سے وہ داتی یار (چائے دوب) چلے گئے اور یہاں پر دوکانداری کا دھندا جاری رکھا۔ اس زمانے میں وہ ایک معمول کی زندگی گُزارتے تھے اور کبھی کبھی ہنسی مزاق میں بھی حِصّہ لیتے تھے۔ اس دور میں آپ نے اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو ملا کر ایک جماعت ترتیب دی، جس کی پیشوائی آپ ہی کے ذِمے تھی۔ یہ جماعت مِل جُل کر تلہ مُلہ، مہادیو اور وچارناگ یاترا کا اہتمام کرتی، ست سنگ کی محفلیں بھی آراستہ کرتی۔ گوپی ناتھ جی سدا ہی بے ایمانی کے زبردست مخالف تھے اور ہر مُعاملے میں جرّی اور بیباک ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ ہاں، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہیں سادھوؤں اور سنتوں سے دِلی پریم تھا اور وہ اُن کی مجلسوں میں شوق سے جایا کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ حبہ کدل میں پنڈت زنہ کاک کے پاس جایا کرتے تھے۔ اِس مہاپرش کے پاس آنے جانے کا سِلسلہ اُس زمانے سے برابر جاری تھا جب وہ ساتویں میں

پڑھتے تھے۔ پنڈت زنہ کاک کے دیہانت کے بعد بھی آپ سالہا سال تک وہاں جاتے تھے۔ وہ جٹاداری سنت سوامی بالک کاک کے پاس جاکر اُن کے پیر دباتے اور اُن سے فیض حاصل کرتے تھے۔

گوپی ناتھ جی کے ایک شناسا پنڈت دینا ناتھ شالی کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں بھگوان جی کے ننھیال والے اور شالی گھرانے کے لوگ مٹن یاترا کے لئے وجے سپتمی کے موقع پر ڈونگے کے ذریعے کھنہ بل تک گئے مگر بھگوان جی اپنے ایک دو دوستوں کو ساتھ لے کر بیچ راستے میں ہی ڈونگے سے اُتر کر جیون صاحب کی کُٹیا پر گئے۔ سیکہ ڈافر میں بھگوان جی نے ۱۴ سال تک قیام کیا۔ یہیں پر اُنہوں نے اپنی بہن جانکی دیوی کا وِواہ بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بھگوان جی نے اُسی زمانے میں چرس پینا شروع کر دیا تھا جب وہ سوامی زنہ کاک کے پاس جایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ اُنہوں نے دمِ واپسین تک جاری رکھا۔

۱۹۲۸ء میں بھگوان جی نے اپنی دوسری بہن دیوکی سے کہا کہ اب سیکہ ڈافر کو چھوڑنا ہے۔ سیکہ ڈافر سے وہ عالی کدل کے مُنشی محلہ میں پنڈت ٹیکہ بابو کے مکان میں مُنتقل ہوگئے۔ اِسی مکان میں اُنکے پتا کا دیہانت ہوگیا۔ اس مرحلے پر اُنہوں نے مکمل خاموشی یعنی مون دھارن کیا تھا مگر ابھی انہیں ایکانت کو پراپت کرنا تھا۔ گھر کے کام کاج میں شامل ہونے کے علاوہ انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں بھی شرکت کی۔ ٹیکہ بابو کے مکان میں اُنہوں نے دو سال تک قیام کیا۔

۱۹۳۰ء میں آپ نے رنگہ ٹینگ کے پنڈت دینا ناتھ بھوٹا کے مکان کو اپنا نواس بنالیا۔ اُنہوں نے یہاں سات سال تک قیام کیا۔

یہیں سے وہ کٹھور سادھنا میں مگن رہنے لگے۔ دیودار کی طرف منہ کئے وہ بستر پر لیٹے نظر آتے تھے۔ اُن کے کمرے میں دِن اور رات ایک دیا روشن رہتا تھا۔ یہاں پر کچھ گنے چنے لوگوں کے سوا کسی اور کو کمرے میں قدم رکھنے کی اِجازت نہیں تھی۔ اُن کا بستر بھی گھس گیا تھا اور وہ اسے صاف کرنے یا اُلٹ پلٹ کرنے پر بھی راضی نہیں ہوتے تھے۔ کمرے میں مکڑیوں کے بے پناہ جال بنے تھے۔ اِسی دوران چوہوں نے اُن کی ایڑی میں چھید بھی کر دیا تھا، جو کافی دیر تک رِستا رہا مگر بھگوان جی نے کبھی بھی زخم کا ذِکر تک نہیں کیا۔ سادھنا کے ایک مشکل دور میں آپ کبھی کبھی دتورہ، افیم یا دوسری کسی ایسی چیز کا آہار کرتے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ کٹوری بھر خون بھی اُگل دیتے تھے۔ اُن کا سارا شریر سوج گیا تھا۔ اس دوران ایک بار بہن نے اُن سے مخاطِب ہو کر کہا: "ہم لوگ کتنا بھاری دُکھ برداشت کرتے ہیں"۔ اس پر اُنہوں نے جواب دیا "ہماری نیا سمندر کے بیچوں بیچ ہے، یا تو ہم دونوں صحیح سلامت پار اُتر جائیں گے ورنہ دونوں ڈوب جائیں گے"۔ سادھنا کے اس دور میں یا تو آپ مہینوں کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے اور کبھی کبھار کافی مقدار میں بھوجن کا آہار کرتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں آپ بہن دیومالی اور بڑے بھائی پنڈت گووند جو کے ساتھ ڈل حسن یار چلے آئے۔ وہاں پر یہ پریوار پنڈت نیلہ کول مرآف کے مکان میں سکونت پذیر ہوا۔ اس جگہ اُن کا آسن دوسری منزل کی ایک کھڑکی پر تھا۔ یہاں سے وہ آسانی کے ساتھ شارکا پربت اور شنکر آچاریہ کا نظارہ کر سکتے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب لوگوں نے اُن کے پاس آنا جانا شروع کیا تاکہ اُن کی کامنائیں پوری ہوں۔ سادھنا کا یہ حال تھا کہ وہ چادر یا

پہر مگن رہتے تھے۔ دُنیا میں رہ کر بھی وہ دُنیا سے دُور نکل جاتے تھے
اِسی لئے ضرورت مندوں کو اپنی بات سنانے کے لئے اُنہیں جگانا پڑتا تھا۔
بات سُن کر وہ مُختصر سا جواب دیکر پھر سمادھی میں لین ہو جاتے تھے۔ بیچ بیچ
میں وہ اُٹھ کر ہاری پربت یا کسی اور پوتر استھان کا رُخ کرتے اور کچھ وقت
بتا کر واپس اپنے آسن پر آ بیٹھتے تھے۔ ڈل حسن یار میں قیام کے دوران
بھوانی کے تیرتھ استھان پر وہ کبھی مہینوں بیٹھے رہتے تھے اور کبھی کبھی
کچھ دِنوں کے لئے استھاپن میں جمے بیٹھے رہتے تھے۔

بھگوان جی کے بڑے بھائی پنڈت گووند جو بھان ۱۹۴۶ء تک
اُن کی خدمت گزاری کرتے رہے اور سارا بار اپنے کندھوں پر اُٹھائے
گھر کی گاڑی کو آگے بڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جس دِن اُن کے بھائی
کی موت ہوئی اُس دِن وہ منہ اندھیرے کھیر بھوانی چلے گئے اور وہاں پر
دائیں ہاتھ پر یہ کہہ کر پٹی بندھوائی کہ اُن کا دایاں بازو ٹوٹ گیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں بھگوان جی بہن کے ساتھ مادھو جو سُتھو
کے گھر پدھارے اور سادھنا میں مگن رہے۔ چلم اور چرس اب اُن کے
رات اور دن کے ساتھی تھے۔ باطن کے اسرار و رموز اب اُن پر کُھل گئے
تھے اور اُن کی نظروں میں وہ وسعت آگئی تھی کہ ماضی، حال اور مُستقبل
اُن کے سامنے معلق تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ پنڈت
مادھو جو سُتھو کے مکان میں رہے۔ مگر دوسری طرف سے آئے ہوئے
بلاوے کو وہ ٹال نہیں سکے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں چندہ پورہ چلے گئے
اور یہیں پر انتردھیان ہو گئے۔

بھگوان گوپی ناتھ جی کی شخصیت کی کتھا کیا۔ مجھ جیسے کم نصیب

کے بس کی بات نہیں۔ میری نظریں تو محدود کی زنجیروں میں قید ہیں جبکہ اُن کی ذات محدود نہ تھی بلکہ لامحدود ہو گئی تھی۔ میں نے تو بس کوشش کی ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند تو نہیں کیا جا سکتا، ہاں اِشاروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ میں نے تو بس اِشارے کئے ہیں مگر اُن کی گرانقدر ذات کا احاطہ کرنا اپنی بساط سے باہر نظر آیا۔ سہو اور خطا کے لئے عفو کا طلب گار ہوں۔ بھگوان جی کے عقیدت مندوں نے کھریار سرینگر میں اُن کے نام پر بھگوان گوپی ناتھ آشرم قایم کیا ہے۔ یہاں اُن کی سنگ مرمر کی ایک خوبصورت پرتیما نصب کی گئی ہے۔ آشرم ایک رجسٹرڈ اِدارہ ہے۔

●

کتاب نامہ

- ★ MEMENTO IN THE SACRED MEMORY OF BHAGWAN SHREE GOPI NATH JI —— AUGUST. 1974
- ★ BHAGWAN SHREE GOPI NATH JI TRUST. NEWS LETTER, 1982
- ★ MEMENTO BHAGWAN SHREE GOPI NATH JI SAHAI. 1978
- ★ THE B.G.T. PATRIKA — 1987
- ★ MEMENTO — do — 1988
- ★ BHAGWAN GOPI NATH JI (BIOGRAPHY) by Pt. S.N. Fotedar
- ★ INDIGO INDIAN OF MYSTIC EAST. H.N. KAUL
- ★ THE SAFFRON OFFERING — Editor C.L. Sapru
- ★ THOUGHTS AND MEDITATIONS — Khalil Gibran

●

ہرگوپال کول خستہؔ

کیا بتائیں جہاں میں کیا دیکھا
ہر طرف جلوۂ خُدا دیکھا
ہم نے دُنیا کو آزما دیکھا
جس کو دیکھا غرض، فنا دیکھا
کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم
دم تو ہر دم گیا ہُوا دیکھا
صحبتِ پیر زالِ دُنیا میں
آشناؤں کو ڈوبتا دیکھا
خوب ڈھونڈا جہاں میں اے خستہؔ
خستگی کا نہ آشنا دیکھا

یہ سیدھے سادے اشعار ایسی زندگی اور شخصیت کے باطن کی عکاسی کرتے ہیں جس کے نقوش کشمیر کی سماجی، سیاسی، علمی اور اَدبی زندگی پر ثبت ہیں۔ میری مُراد پنڈت

ہرگوپال کول خستہ سے ہے جو کشمیر نژاد تھے اور ۱۸۸۶ء میں
اپنے خاندان کے ساتھ پٹیالہ سے، ڈوگرہ راجہ مہاراجہ رنبیر سنگھ
(۱۸۸۵ء - ۱۸۸۶ء) کے عہد میں کشمیر منتقل ہوئے۔ پنڈت
ہرگوپال کول نے اپنی مصنفہ تاریخ "گلدستۂ کشمیر" میں اپنے
اور اپنے اسلاف کے بارے میں کچھ اشارے کئے ہیں۔ اسی
طرح اپنے قصہ "گلزارِ فوائد" میں بھی اُنہوں نے کچھ باتیں اپنے
بارے میں اور لکھی ہیں۔ اُن کے بھائی پنڈت سالک رام نے بھی
اپنی داستانِ نثر کے دیباچے میں اس ضمن میں تفصیل سے لکھا
ہے جس کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خستہ کے آباؤ اجداد
کشمیر الاصل تھے۔ اُن کے اسلاف کا شمار اپنے عہد کے معززین
میں ہوتا تھا۔ سرینگر کے محلۂ ریّہ ٹینگ (رعناواری) میں اُنکی
ملکیتی اراضی تھیں۔ سکھوں کے عہدِ حکومت (۱۸۴۱ء - ۱۸۲۰ء)
میں لاہور چلے جانے کے بعد بھی اُن کے تعلقات کشمیر سے قائم
رہے۔[1] خستہ کے جواں سال ہم عصر شاعر، ادیب، محقق اور مؤرخ
منشی محمد الدین فوق (۱۹۴۵ء - ۱۸۷۷ء) مصنف "تاریخ
اقوامِ کشمیر" کے بیان کے مطابق پنڈت خستہ اور سالک کے
والد پنڈت رام چندر کول لاہور اور کشمیر دونوں جگہ رہتے تھے۔
پنڈت سالک رام نے لکھا ہے کہ اُن کی ریّہ ٹینگ کی جائداد
"کول میراث" کے نام سے موسوم تھی۔ اُن کے دادا گاشہ کول

---

[1] کشمیر کے دو ادیب۔ دو بھائی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔
مطبوعہ ۱۹۶۶ء ص ۲۲

اور پردادا مہادیو کول کشمیر کے معتبر لوگوں میں سے تھے۔ اُن کے چچا پنڈت کیلاش ناتھ کول لُدھیانہ میں محکمۂ بندوبست کے عہدہ دار تھے۔ پنجاب میں کافی عرصہ گزارنے کے بعد اُن کا خاندان پٹیالہ چلا گیا۔ اُن کے پٹیالہ جانے کا سبب دونوں بھائیوں کی تحریروں سے نہیں ملتا۔ یقیناً سلسلہ روزگار ہی رہا ہوگا۔ 'گلزارِ فوائد' کی تمہیدی عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اسکول کی مُلازمت تھی پنڈت ہرگوپال کے ساتھ سارا خاندان پٹیالہ چلا گیا تھا۔ پنڈت سالک رام اُس وقت کم عُمر تھے اور پٹیالہ کے مہاراجہ کالج میں داخل ہو گئے تھے۔

پنڈت ہرگوپال خستہؔ کی وِلادت کا سنہ دستیاب نہیں۔ آنجہانی پنڈت شِو نرائن فوتیدار کے بیان کے مطابق خستہؔ یکم ماگھ ۱۹۸۰ سنہ بکرمی (جنوری ۱۹۲۲ء) انتقال کر گئے۔ اُن کے انتقال پر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے تعزیتی تار بھیجا تھا اور کشمیر کے مُمتاز مجاہدِ آزادی اور سماجی رہنما پنڈت کشپ بندھو نے اخبار "سماج سُدھار" میں خستہؔ کے بارے مضمون لکھا تھا جس کے آخر میں یہ شعر مؤثر انداز میں درج کیا تھا ؎

ہم ترے دیدار کو یُونہی ترستے رہ گئے
دیدۂ مُشتاق کے بادل برستے رہ گئے

انتقال کے وقت خستہؔ کی عُمر قریباً ۷۵ سال تھی جس کے مُطابق یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۴۸ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ گو کہ اُن کی جائے پیدائش کا کہیں ذکر نہیں، چونکہ اُن کا خاندان عرصہ سے لاہور ہی میں مقیم تھا اس لئے اُن کا جنم یقیناً

لاہور ہی میں ہوا ہوگا جہاں اُن کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی۔ پنڈت خستہ کے پھر وطن مالوف کو آنے کے وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آبائی وطن کی محبت نے شملہ کی پہاڑیوں کو دیکھ کر ضرور کروٹ لی ہوگی اور وہ کشمیر آنے کیلئے بیتاب ہوئے ہونگے۔

چنانچہ پنڈت جیالال کلم مُصنّف "اے ہسٹری آف کشمیری پنڈتس" کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے پنجاب میں قیام کے زمانے میں برطانوی حکومت کی جانب سے کچھ سیاسی خدمات اُن کے تفویض رہیں جنکی بنا پر وہ لاہور سے پٹیالہ چلے گئے۔ اپنے خاندانی تعلق کا تذکرہ کرنے کے بعد پنڈت ہرگوپال پٹیالہ میں اپنی مُلازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بندہ کو اتفاق سے بہ بہانہ مُلازمت پٹیالہ (جو ریاست بہ ہمہ وجوہ فیض بخش اور قابلِ تعریف ہے) کوہستانِ شملہ پہنچا دیا جہاں پہاڑوں کے دیکھنے سے حبُ الوطنی نے کشمیر دیکھنے کا شوق پیدا کیا" اُن کے چھوٹے بھائی پنڈت سالک رام نے اپنے ایک شعر میں اپنے خاندان کے کشمیر لوٹ آنے کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

ہند کو چھوڑوں میں تیاریٔ کشمیر کروں
سرد مہریٔ بُتاں کی کوئی تدبیر کروں

جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ پنڈت ہرگوپال ۱۸۷۶ء میں واردِ کشمیر ہوئے جب یہاں کے لوگوں کو شدید قحط کا سامنا ہوا۔

ش کشمیر کے دو ادیب ــــ دو بھائی ــــ ص ۲۵

خستہ خود لکھتے ہیں کہ کشمیر آنے کے بعد اُنہوں نے کچھ عرصہ یہاں سیر و سیاحت میں گُزارا۔ جس کے بعد اُن کو تلاش معاش کی فکر ہوئی اور اتفاقاً ڈاکٹر جیگور کی وساطت سے میجر۔پی۔ ڈی۔ ہنڈرسن، آئی۔سی۔ ایس افسر برائے اسپیشل ڈیوٹی کشمیر سے اُن کی مُلاقات ہوئی۔ اُنہوں نے خستہ کی مدد کی اور چندے وطن میں رہنے کی صورت نکل آئی۔ میجر ہنڈرسن کی وساطت سے کرنل ہنری جو اُن دِنوں ریذیڈنٹ تھے سے اُن کی شناسائی ہوئی۔ میجر ہنڈرسن چونکہ خستہ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے اِسلئے اُنہوں نے کرنل ہنری سے یہ سفارش کی کہ وہ کشمیر کے معاملات میں اُن سے ضرور مشورہ لیا کریں۔ سابق چیرمین قانون ساز کونسل سورگباشی شِو نرائن فوتیدار (وفات ۔ ۱۹۷۸ء) کے بیان کیمطابق وہ یہاں کسی اِسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ خستہ نے خُود اِس امر کی طرف اِشارہ کیا ہے کہ یہاں اُسی زمانہ میں مطبع تحفۂ کشمیر کی مینجری اور ایڈیٹری بھی اُن کے سپُرد ہوئی تھی لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خدمت زیادہ دیر تک انجام نہیں دے سکے کیونکہ اُن کی طبیعت اِس کام سے جلد اُکتا گئی اور اسے ترک کردیا۔

خستہ کی طبیعت کہاں ایک جگہ ٹکتی۔ دیوان اننت رام کے وسیلہ سے وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے متوسلین میں شامل ہوئے اور عہدۂ اخبار نویسی کل ملک وغیرہ پر مُمتاز ہوئے۔ اُن کے فرائض میں داخل تھا کہ وہ ہر روز شام کو مہاراجہ کے دربار میں جاتے اور شہر کے اخبار سُنایا کرتے تھے اپنی فہم و فراست کی وجہ سے وہ

جلد ہی مہاراجہ کے منظورِ نظر ہو گئے۔ جیسا کہ عام طور ہوتا آیا ہے
ایسا ہی ہرگوپال خستہ کے ساتھ ہوا۔ لوگ اُن کے ڈوگرا دربار میں
عالی رُتبہ ہونے پر جلنے لگے۔ وہ تاک میں رہے کہ کب موقعہ ملے
اور وہ خستہ[۲] پر وار کر سکیں۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء کے شدید قحط نے
وہ دِن دکھایا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے قحط کی صعوبتوں کو کچھ کم
کرنے کی خاطر سرکار کی جانب سے دھان کی تقسیم[۳] کا بندوبست
کیا جس کے لئے شہر سرینگر کو کئی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پنڈت
ہرگوپال کو بھی ایک حلقہ کا نگران افسر مقرر کیا گیا۔ اُن کے خلاف،
حکومت کو درخواستیں موصول ہوئیں کہ ہرگوپال خستہ شالی کی تقسیم
کاری میں خیانت کر رہے ہیں۔ حکومت ہند کے پاس بھی درخواستیں
گئیں کہ قحط زدہ لوگوں کو بوروں میں بھر کر کشتیوں سے جھیل وُلر
لے جا کر ڈبویا جا رہا ہے۔ یہ بڑا ہی سخت الزام تھا۔ حکومت ہند نے
مہاراجہ سے باز پُرس کی۔ اُدھر مہاراجہ کے ذہن میں خستہ[۲] کے
مُخالفین نے یہ بات بٹھا دی کہ اِن گمنام درخواستوں کا باعث وہی
ہیں۔ چنانچہ اُن کے چھوٹے بھائی کی ریذیڈنسی میں مُلازمت کو بھی
اُچھالا گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اِن دونوں بھائیوں کی طرف سے بدظن
ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دِن پنڈت ہرگوپال کو مہاراجہ نے
اپنے دربار میں بُلایا اور اُن سے اپنی ناراضگی بھی ظاہر کرتے ہوئے
سخت وسُست بھی کہا۔ پنڈت ہرگوپال نے بڑی جُراءت کا
مُظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ "اگر سرکار، سرکار نہ ہوتے
اور میں سرکار کی رعیت نہ ہوتا تو جو زبان سرکار نے میرے

بارے میں استعمال کی ہے، شاید میرا جواب بھی اُسی زبان میں ہوتا۔
مہاراجہ نہایت برافروختہ ہوئے اور تلوار میان سے نکال لی اور
غصہ میں شاید ہرگوپال پر وار کر بیٹھے، لیکن وزیر پُنوں کی دربار
میں موجودگی سے حالات قابُو میں رہے۔ اُنہوں نے بڑی متانت اور
سنجیدگی سے اُنہیں یاد دِلایا کہ "سرکار کو اس بات پر فخر کرنا چاہیئے
کہ سرکار کی رعایا میں ایسے سرفروش بھی موجود ہیں جو سرکار کے
روبرو ایسی بات کہہ سکتے ہیں"۔ معاملہ کی تحقیقات ہوئی۔ مہاراجہ
کو اِلزام سے بری قرار دیا گیا اور خستہ و سالک کو قید کی سزا ہوئی۔
۱۸۷۹ء کے واقعات کا ذکر "گلدستۂ کشمیر" میں تفصیل سے ہے
اور قدرے مختلف انداز سے بھی۔ جیا لال کلّم نے لکھا ہے کہ ہرگوپال
خستہ نے اس معاملہ میں بڑی جُرأت واستقامت کا ثبوت دیا۔ قلعہ
باہو، جموّں میں یہ دونوں بھائی تین سال قید رہے۔ اسی زمانے
میں ہرگوپال خستہ نے "مثنوی گوپال نامہ" لکھی جس میں کشمیر کے
قحط و دیگر سیاسی اور ذاتی احوال کے بارے میں تفصیل سے
لکھا گیا ہے۔ اِس میں مہاراجہ کے دربار کی سازشوں کو بے نقاب
کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ مثنوی زیورِ طباعت سے آراستہ
نہ ہوسکی، لیکن سرگباشی شِو نرائن فوتیدار سے پروفیسر عبدالقادر سروری
نے جو جستہ جستہ اشعار زبانی نقل کئے اُن کا یہاں پیش کرنا دلچسپی
سے خالی نہیں ہوگا۔

پلا ساقیا مجھ کو بھر کر شراب — کہ ہوتی ہیں اب کشتیاں زیرِ آب
قضارا اِن ایام میں دوستو — پڑا قحط کشمیر میں چار سو

وہ نہ تھا قحط یا تھا وہ قہرِ خُدا　　کہ زیر و زبر جس سے عالم ہُوا

گرفتاری اور قلعہ باہو میں قید کئے جانے کا ذکر بھی دیکھئے کسطرح کرتے ہیں۔ ابیات کا اعادہ کرنا یہاں بے جا نہیں ہوگا کہ اُس وقت کا پولیس افسر رائے رادھا کرشن تھا جو اُن کو قلعہ باہو پہنچانے میں پیش پیش تھا۔

سپاہی ہوئے پھر تو ہمراہ مرے　　کچھ اِدھر اُدھر، کچھ وُرے کچھ پرے
کوئی ہاتھ میں لے کے تیغ دودم　　کوئی کر کے بندوقِ سنگین خم
چلا تھا نہ راہی جو فرسنگ بھی　　تو چلنے میں گھبرا اُٹھا اُس کا جی
کہاں اسپ و کشتی پہ ہوتا سوار　　کہاں ایڑیاں اب رگڑتا نجار
کہاں ساتھ رہتے تھے نوکر مدام　　کہاں پڑ گیا پہرہ والوں سے کام
کہاں حکم کرتا تھا لیل و نہار　　کہاں ہوں میں محکوم اور تابعدار
کہاں بستر نرم بھی خار تھے　　کہاں خارِ راہ سینہ افگار تھے

اُس زمانے میں یہاں اُردو کے عروج و ارتقاء پر تاریخی تناظر میں نظر ڈالتے ہوئے اِس معاملہ یعنی خستہؔ کے پابجولاں کئے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں کہ اُس دور میں اُردو کا کشمیر میں ایک اور بڑا کارنامہ یہ رہا کہ وہ یہاں انقلاب اور نجات کا پیغام لے کر بھی آئی اور اظہار کی آواز بھی بن گئی۔ پنجاب میں اُردو صحافت پچھلی صدی کے آخری وسط میں برگ و بار لائی تھی۔ اِن اخبارات میں کچھ تو کشمیریوں کے ہاتھوں میں تھے (جیسے اخبارِ عام لاہور) کشمیر پر بھی اِن کی توجہ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نشریات کشمیریوں کا ذہنی لمس پا کر ایک ہی اتھل پتھل کی بشارت

دے رہی تھیں۔ چنانچہ کشمیر میں باقاعدہ سیاسی بیداری کا عنوان
اُردو صحافت ہی نے تحریر کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی کشمیری پنڈتوں
کے ایک طبقہ سے ٹھن گئی، جس کے پسِ منظر میں سیاسی اور اقتصادی
دونوں وجوہات کارفرما تھیں۔ کشمیری پنڈت وادی کے سب سے
زیادہ تعلیم یافتہ لوگ تھے ...... جموں کے حکمران خاندان نے وہاں
کے نسبتاً نوآموز اقارب اور بیرونِ ریاست کے یقینی طور پر زیادہ
پڑھے لکھے لوگوں کو کشمیر کی اِنتظامیہ میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔
کشمیری پنڈتوں کو اپنی روزی اور روٹی کے لالے پڑنے لگے ... اِس
مرحلے پر کشمیریوں کی ترجمانی ہرگوپال خستہ[3] نے کی۔ اُس نے کشمیر
کے قحطِ عظیم میں رنبیر سنگھ کے اِنتظامیہ کی کڑی نکتہ چینی کی اور
یہ آواز اُردو کے اخبارات 'ریفارمر'، 'خیرخواہ' اور 'زاوی' وغیرہ کے
صفحات میں بُلند کی گئی۔ اِس شوروشیون سے جموں وکشمیر کی
حکومت اس قدر زچ ہو گئی کہ آخر کار خستہ کو باہو قلعہ میں پابہ جولاں
کردیا گیا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ خستہ کو عوام نواز آواز
کا جواب بھی لکیر کے فقیر ایک کشمیری پنڈت راجہ کول عرض بیگی
ویری نے دیا۔ یہ مصاحب صفت مداح اُردو میں نہ سما سکی اِسلئے
فارسی میں تحریر ہوئی۔

سالک رام کے علاوہ ہرگوپال کے ہمراہ اُن کے اور تین[3]
چھوٹے بھائی جانکی ناتھ، سری کشن اور شیو ناتھ بھی تھے، اُن کا ذِکر

---

[3] کشمیر میں اُردو ...... حِصّہ ۲ م عبدالقادر سروری مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر ص ۱۱-۱۲۔

ذیل کے اشعار میں کیا گیا ہے ؎

ہیں بھائی میرے تین اور خورد سال
ہوئے وہ بھی ہمراہ باحالِ زار

پھر مثنوی کا اختتام اس اُمید پر ہوتا ہے کہ خُدا کی بارگاہ میں دیر ہے اندھیر نہیں ؎

خُدا خود سُنے گا تِری یہ دُعا
کہ بخشے وہ بخشندہ ہے کبریا

تو خاموش رہ اس کا کیا ذکر ہے خُدا سر پہ ہے تیرے کیا فکر ہے

یہ مثنوی دو سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے اور دورانِ اسیری قلعۂ باہو میں تکمیل پذیر ہوئی تھی۔ خستہ نے مہاراجہ پر ایک اور طنزیہ نظم "نرسنگھ اوتار" بھی لکھی تھی جسکے چند اشعار پیش کرنا یہاں باعثِ دلچسپی ہوگا ؎

ستم گر اِس جگہ لے کر ستم تو قیامت کو اُٹھائے گا اَلم تو
نہ کر مُنہ کالا تو اپنی بدی سے بدی آخر بدی ہے اور بدی ہے
شکارِ شیر آہو سے کیا ہے مگر مور و مگس تیری غذا ہے
جو ہیں شاہ اُنکو شاہوں سے ہے کینہ تجھے لیکن گداؤں سے ہے کینہ
نہیں ہے فوج میرے پاس کوئی چڑھاؤں گا جو تجھ پہ لاکے وہ ہی

خستہ کی قلعہ باہو میں اسیری کے دوران ایک دو دلچسپ واقعات پیش آئے جن سے اُن کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک روز مہاراجہ رنبیر سنگھ قلعہ کے معائنہ کے لئے آئے۔ خستہ کی خیریت دریافت کرتے ہوئے اُن سے پُوچھا کوئی تکلیف تو

نہیں ہے؟" خستہ نے جواب دیا۔ سرکار کی عنایت سے سب کچھ ٹھیک ہے۔" پنڈت سالک رام نے بھی ایسا ہی جواب دیتے ہوئے یہ شکایت بھی کی کہ صبح کے وقت جب وہ پوجا پاٹ میں مصروف ہوتے ہیں تو اُن پر متعین سنتری پاس بیٹھے حُقّہ پیتے اور بلند آواز میں گفتگو کرتے ہیں جس سے پوجا کرتے وقت اُنکے دھیان گیان میں خلل ہوتا ہے۔ مہاراجہ نے سنتریوں کو حُکم دیا کہ سالکرام جب پوجا میں مصروف ہوں تو ذرا دور جاکر بیٹھا کریں۔ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ کچھ دن یوں ہی گزر گئے۔ ایک دن جب سنتری پنڈت سالک رام کی کوٹھری کے پاس واپس لوٹے تو سالک رام کو غیر حاضر پایا۔ اس پر تہلکہ مچا۔ بڑی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ پنڈت سالکرام نے کوٹھری میں سرنگ بنایا اور اُسی راستے سے فرار ہو گئے۔

پنڈت ہرگوپال نے مہاراجہ پر الزام لگایا کہ سالک رام کو قتل کیا گیا ہے اور جرم کو چھپانے کیلئے سرنگ کا قصّہ مشہور کیا گیا ہے۔ چنانچہ سالک کی زور و شور سے تلاش شروع ہوئی۔

ایک اور واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ پنڈت ہرگوپال ایک دن اپنی کوٹھری سے باہر برآمدے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے ایسے میں اُنہوں نے کسی شخص کو احاطہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ قریب آکر پنڈت ہرگوپال کی حرکات سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ خستہ بہت ہی برافروختہ ہوئے اور اُس شخص کی خوب پٹائی کی کہ اُس کو کیا حق ہے کسی کی خلوت میں مداخلت کرنے کی۔ یہ دراصل مہاراجہ رنبیر سنگھ کے سالے سادل سنگھ تھے جو شاہی

نامی ایک راجپوتنی یہ سارا واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ پٹنے والا کون شخص ہے۔ اس لئے اُسے ہرگوپال کی یہ جرأت دیکھ کر بڑا اچھنبا ہُوا اور یہ سمجھنے لگی کہ یہ بڑا ہی سُورما اِنسان ہے جو مہاراجہ رنبیر سنگھ سے جھگڑا مول لینے پر آمادہ ہے۔ راجپوتنی کے دِل میں ہرگوپال خستہ کا بڑا احترام پیدا ہوگیا۔ وہ اُنہیں اَوتار سمجھنے لگی اور اپنی عقیدتمندی سے اُنہیں روز روٹی لاکر دینے لگی[1]۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

بجُز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

جب پنڈت ہرگوپال خستہؔ قلعۂ باہو (جموّں) سے رہا ہوکر اور بقول جیالال کلم سیالکوٹ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد سرینگر آئے تو مہاراجہ رنبیر کا انتقال ہوچکا تھا اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۸۸۵ء ـ ۱۹۲۵ء) گدی نشین ہوچکے تھے۔

اَب کہاں قِسمت آزمانے جائیں

جب کوئی خنجر آزما نہ ہُوا

ازاں بعد خستہؔ نے اپنی زندگی سماجی بہبود و اصلاح اور تعلیمی کاموں کیلئے وقف کردی۔ اُس زمانے میں کشمیری پنڈتوں میں بھی لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کو آوارگی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اُنہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی صاحبزادی پدماوتی دیوی کو جو کم سنی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں، اس کا صدر مدرس مقرر کیا۔ بیواؤں کی

---

[1] کشمیر کے دو ادیب۔ دو بھائی۔ عبدالقادر سروری۔ ۱۹۶۵۔ ص۔ ۳۵۔ ۳۹

دُوسری شادی کرانے کی بھی، جن میں اُن کی اکلوتی بیٹی بھی شامل تھی، جان توڑ کوشش کی۔ لیکن کشمیری پنڈت سماج نے اُن کی اِس قدر شدت سے مخالفت کی کہ اُنھیں بالآخر اپنا یہ عہد آفرین اور نیک اِرادہ ترک کرنا پڑا۔ پنڈت ہرگوپال کی شادی چکو خاندان سے ہوئی تھی۔ اُن کی صِرف ایک بیٹی پدماوتی تھیں، جن کی شادی کم عُمری میں ہی ہوئی تھی اور جو بال وِدھوا ہو گئی تھیں۔ پنڈت خستہ نے دو لڑکے مُتبنیٰ لیے جنہیں سے ایک کا نام شاد کا پرشاد تھا اور وفات پا چُکا۔ دوسرے کی بیوی بھی اولاد سے محروم تھی، اس کیلئے شِونرائن فوتیدار کو اپنی صاحب زادی پدماوتی کے لئے مُتبنیٰ کیا تھا جس نے آخری دم تک وفاداری اور تابعداری کے ساتھ اُنکا ساتھ نبھایا۔ البتہ لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں کڑی مُخالفت کے باوجود اُنھیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ بقول اِقبالؔ ؎

زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز

اِسطرح خستہ کی مُستحسن کوشِشوں سے قائم ہوئے سکولوں کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔ لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنھیں لڑکوں کی تعلیم کا بھی خیال رہا چنانچہ اُن کی اور سالک رام کی کوششوں کے نتیجہ میں سرینگر میں پہلا تعلیمی اِدارہ ہندو ہائی سکول قائم ہُوا جو بعد میں سِری پرتاپ کالج کے نام سے کشمیر کا پہلا اور بڑا کالج بن گیا۔ کمسِن بیواؤں کی دُوسری شادی کے معاملے میں بھی کشمیری پنڈت اُن کے رفتہ رفتہ ہمنوا بن گئے۔

اہلِ جنوں کو چین سے بیٹھنا نصیب کہاں۔ سہہ یار نوا کرل

میں خستہ کی رہائش گاہ کے سامنے ایک مولوی صاحب رہا کرتے تھے[۲] جو اپنی مکان کی بالائی منزل میں درسِ قرآنِ مجید دیا کرتے تھے۔ اُن کے مکان کی ایک کھڑکی خستہ کے صحن کی طرف کھُلتی تھی جہاں باغ کے علاوہ، نہانے کا ایک حوض بھی تھا۔ پنڈت خستہ نے کئی بار اُنہیں وہ کھڑکی بند کرنے کو کہا۔ مولوی صاحب اِس بات کے لئے اِس وجہ سے راضی نہیں ہوئے کہ ایسا کرنے سے اُن کا کمرہ تاریک ہو جاتا۔ ایک دِن پنڈت خستہ اُچک کر مولوی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے اور اُن کے ساتھ درشتی سے پیش آئے۔ بات بڑھی اور مُقدّمہ چلا اور خستہ[۳] کو بری کر دیا گیا۔ لیکن اُن کو ریذیڈنٹ کی زبانی صلاح کے مُطابِق ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر ریاست سے باہر چلے جانے کو کہا گیا۔ پنڈت خستہ[۳] نے جلا وطنی میں امرتسر سے دو اردو اخبار 'راوئ بے نظیر' اور 'صُبح کشمیر' جاری کئے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے اِختیارات محدُود کئے گئے تھے۔ پنڈت خستہ نے اپنے زورِ قلم سے رائے عامہ کو اُنکے حق میں منظم کیا اور ۱۸۹۱ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو کونسل آف ایجنسی کا پریذیڈنٹ مُقرّر کیا گیا۔ جلا وطنی کے بعد پنڈت خستہ کشمیر لوٹے تو اُن کا ایک قائد کا سا اِستقبال کیا گیا۔ جسمیں ہندو مسلمان

---

[۲] حسن اِبنِ علی (وفات ۱۳۴۳ھ) کی ڈائری کے اندراجات کے بارے میں کشمیر میں اردو۔ جلد '۲' میں ذِکر کرتے ہوئے مرحوم عبدالقادر سروری نے پنڈت ہرگوپال خستہ[۳] کے مولوی یحییٰ سے ناروا سلوک کرنے اور مُقدّمہ دائر کئے جانے کی تفصیلات کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے لِکھا ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۹۸ء میں پیش آیا ہے۔

سب شامل تھے۔ پنڈت خستہ کی مساعی جمیلہ نے اُنہیں عوام میں ہر دلعزیز بنایا تھا۔ شاہی دربار میں اُنہیں عزّت و توقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور مُلکی مُعاملات میں بھی اُن سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شاعر اور مؤرخ ہونے کے علاوہ پنڈت ہرگوپال خستہ اچھے مقرّر بھی تھے۔ وہ مُسلسل گھنٹوں تقریر کر سکتے تھے اور لوگوں کو اُن کی تقریر سُننے سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ اُن کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ کٹر کشمیری تھے اور کشمیریوں کو اُنکے حقوق دِلانے کے لئے آخر دم تک لڑتے رہے۔ 'بہارِ گلشنِ کشمیر' میں اُن کے بارے صِرف اتنی عبارت درج ہے کہ "آپ اُن چند بُزرگوں میں سے تھے جنہوں نے زِندگی کا ہر لمحہ اپنے وطن اور قوم کی خدمت میں صرف کیا[1]"۔

نجی خطوط بالخصوص اَدبی نوعیت کے خطوط لکھنے والے کے باطن کا آئینہ ہوتے ہیں، جہاں اِنسان اپنا دِل کھول کے رکھ دیتا ہے۔ خطوط کی روزن سے ہم کسی کے مِزاج کے اندرون کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ خستہ کے نام اُن کے دوست پروفیسر لچھمی دھر کلہ کے خطوط اور اُن کے جواب میں خستہ کی آخری تحریروں سے اُن کی وفات کا صحیح ماہ و سال یعنی جنوری ۱۹۲۳ء کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لچھمی دھر کلہ اور خستہ کی مراسلت مُختصر سہی لیکن اُنکی زِندگی کے آخری ایام کے بارے میں ہونے کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے۔ وہ ۵۹
(لچھمی دھر کلہ) لکھتے ہیں :۔

---

[1] کشمیر کے دو بھائی۔ دو ادیب۔ سروری۔ ص ۲۳۔۲۵

"جناب ہرگوپال صاحب سے میری تحریری واقفیت کا
سِلسلہ ۱۹۲۳ء سے شروع ہوکر پنڈت صاحب موصوف
کے سرگباش ہونے سے کچھ ماہ پیشتر ۱۹۲۳ء ہی میں اختتام
پذیر ہوگیا۔ گویا ہمارے مابین یہ سِلسلہ تبادلۂ خیالات قریب
ایک سال کے لئے جاری رہا۔"

● ــــــ (بہارِ کشمیر۔ لاہور اکتوبر ۱۹۲۴ء)

پنڈت کشپ بندھو، جنہیں کشمیر کے لوگوں کی اصلاح و ترقی سے دِل چسپی تھی، پنڈت ہرگوپال سے سماجی بہبود کے کاموں میں مراسلت رکھتے تھے۔ اُنہوں ۱۹۲۳ء کے آغاز ہی میں پنڈت خستہ[3] کے نام خط لِکھا تھا کہ میں ماہِ مارچ میں مُلاقات کے لئے آرہا ہوں جس کے جواب میں پنڈت خستہ نے اپنے آخری سفر کے بارے میں ظریفانہ انداز میں پیش گوئی کرتے ہوئے لِکھا:۔

"آپ مارچ کے مہینہ میں مجھ سے مُلاقات کے لئے
آرہے ہیں مگر موت مارچ سے پہلے ہی میرے لئے ڈبل
مارچ کرتی ہوئی آرہی ہے۔"

پنڈت ہرگوپال کے انتقال کے کوئی سولہ برس بعد ماہِ جنوری ۱۹۴۰ء میں اُن کی برسی کی یادگار کے طور پر 'بہارِ کشمیر جیتا ہے وہ' عنوان سے لچھمی دھر کلّہ کا مضمون شائع ہوا تھا، جس میں اُن کے خستہ کے نام اور خستہ کے اُن کے نام خطوط سے اقتباسات درج کئے گئے تھے، جن سے اُن کی شخصیت کے کئی مخفی پہلو سامنے آتے ہیں۔

---

[3] کشیر کے ادباء ذو ادیب۔ سرودی۔ ص ۱۲ ۔ ۸۵

پنڈت ہرگوپال خستہ کے ذوقِ عمل کا اندازہ اُن خطوط کے اقتباسات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو اُنہوں نے اُن کے تحریر کردہ آخری خطوط سے محولہ بالا مضمون میں شامل کئے ہیں۔ اُن کا (پچھمی دھر کا) کہنا ہے کہ:۔

"میں حیران تھا کہ اس عالم ضعیفی میں آٹھ آٹھ صفحے کی تحریریں لکھنے کی دِقّت کو پنڈت صاحب کیسے برداشت کرتے ہوں گے۔"

پنڈت ہرگوپال کے خطوط گو دستیاب نہیں لیکن پروفیسر پچھمی دھر کلّہ نے اُن کے کچھ خطوط کے جو اقتباسات پیش کئے ہیں وہ اِس لحاظ سے بڑی اہمیّت کے حامِل ہیں کہ اِن سے اُن کی شخصیّت نظریۂ حیات اور خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ پنڈت کلّہ کے اس خیال ورائے کے جواب میں کہ وہ جب کاروبار ترک کر کے کشمیر کی خِدمت میں اپنی زِندگی وقف کرنا چاہتے ہیں، پنڈت ہرگوپال اُنہیں لکھتے ہیں:۔

"ترکِ کاروبار کرنا میرے خیال میں ویسا ہی معیوب ہے جیسا کہ عدم تعاون۔ اِنسان کے جامہ میں دو گُن ہیں جیو آتما اور مادی۔ اِسلئے دِل بایار، دست باکار، ترک سے بہتر ہے۔"

وہ کشمیر اور کشمیر سے باہر بھی، کشمیری نژاد (پنڈتوں کے) اتحاد کے حامی تھے۔ چنانچہ پنڈت کلّہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"کشمیر اور کشمیریوں سے تو ہنوز کوئی اُمید نہیں۔

اُچھل پڑتے اور دب کر سو جاتے ہیں۔"

خستہ کا یہ نفسیاتی اور عمرانی مشاہدہ آج بھی کشمیری عوام کے حوالہ سے حرف بحرف صحیح ہے۔

"ہمارے بعض...... بھائی بھی اپنی خوش گذرانی پر مغرور ہو کر ایسے دِل شِکن اور واہی تباہی الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ...... قومی اتفاق میں ایک خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔"

کشمیری مسلمانوں سے بھی اُن کو شکایت تھی کہ وہ پنجابی مسلمانوں کے بہکاوے میں آجاتے ہیں اور حکام کی بھی پرواہ نہیں کرتے وہ اِس بات کو بھول جاتے ہیں کہ کشمیری مسلمان محکوم بھی تھے اور مظلوم بھی۔

اِسی خط میں اُنہوں نے اِس امر پر بھی افسوس کیا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کی کوئی تنظیم نہیں ہے۔ وہ کشمیری پنڈتوں کی بالخصوص قومی بہبود کے منصوبے بنا رہے تھے چنانچہ ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"اگر سالانہ جلسہ تک پرماتما نے مجھ کو صحت دی تو دو تین ریفارم پیش کروں گا۔ مدرسوں کا اجراء، تعلیم نسواں کی وسعت، بیواؤں کی دستگیری،..... بال وِدھوا وِواہ"

پنڈت ہرگوپال خستہ دَردِ گُردہ میں مبتلا تھے جس کا ذِکر اُنہوں نے ایک خط میں کیا ہے جسکا اندازِ تحریر بھی قابلِ توجہ ہے جسے پڑھ کر "آرزو لا انتہا فرصت قلیل" منظر و کیفیت والا شعر بے تحاشہ یاد آتا ہے۔ اُن کا ذوق عمل بھی قابلِ داد ہے بقول غالب ؔ ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

"واقعاتِ دُنیا روز بہ روز نیا سبق سِکھلا رہے ہیں۔
کوئی ہمدرد نہیں جسے سینہ کھول کر دِکھلا دُوں۔ بڑھاپے
اور دردِ گردہ نے نِکمّا بنا دیا ہے۔ کام تو ہو ہی نہیں سکتا۔
قلم ہاتھ میں لیتے ہی کانپنے لگتا ہے۔ مگر اُمنگیں زیادہ
تر تیز ہوتی جا رہی ہیں۔"

اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے وہ ذوقِ عمل، وہ لگن، وہ تڑپ اور بنی نوعِ انسان کی بہبود کیلئے وہ خلوص اب ناپید ہے۔ پنڈت خستہ کا تخاطب اگرچہ بالخصوص کشمیری پنڈت برادری کیطرف ہے، لیکن اُسے پھر بھی محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اُن کی اپنی مادرِ وطن کشمیر سے محبت کسی بھی شک شُبہ سے بالاتر ہے جس کی کوکھ سے ہم سب نے جنم لیا ہے۔ یہی وہ بُنیادی وجہ اور بُلند آدرش ہے جسکے پیشِ نظر وہ وطنِ مالوف کو پنجاب سے لوٹ آئے اور یہاں جبر و استبداد کے خِلاف اُسوقت آواز بلند کی جب یہاں کی سیاسی زِندگی مفلوج ہو چکی تھی۔[ش]

[ش] اِس مضمون کی تیاری میں، میں نے اُردو زبان کے ممتاز ادیب محقق اور اُستاد مرحوم پروفیسر عبدُالقادر سروری کی کتاب "کشمیر کے دو بھائی۔ دو ادیب" کا استفادہ کیا ہے، جس کی فراہمی کے لئے میں جناب غلام نبی ناظر کا بہت ہی مشکور ہوں۔

نشاط انصاری

مُلّا محمّد جوّاد انصاری

ہمارا یہ گُل رنگ کشمیر مشک و عنبر کا خلیتہ ہی نہیں، بلکہ باکمال مشائخوں، قدآور شاعروں، دیدہ ور عالموں اور رُوحانی و مذہبی شخصیتوں کا گہوارہ بھی رہا ہے۔ چنانچہ ایران کی سرزمین سے آئے ہوئے جن عارفِ باللہ اور مذہبی بُزرگوں نے آٹھویں صدی ہجری کے ربع الاوّل سے ہی کشمیر کے اطراف و اکناف میں اپنے علم و فضل، اِسلامی تعلیمات اور رشد و ہدایت کے سوتے بہادئے ہیں اُن میں شہر سرینگر کے خانقاہِ سوختہ، نواکدل کے جناب ملّا محمّد جوّاد مرحُوم و مغفور کا مذہبی خاندان بھی نویں دسویں ہجری سے آج تک چشمۂ ہدایت کا منبع رہا ہے۔ مُلّا محمّد جوّاد کے مورثِ اعلیٰ مُلّا عالم فرقہ اثنا عشریہ کے عالم ربّانی اور نشانِ فیوض و برکات جناب میر سیّد حُسین قمیؒ کے انصاروں میں سے ایک خاص انصار مانے جاتے تھے۔ جناب میر صاحب آج سے ساڑھے چھ سو سال قبل ایران کے شہر قم سے تشریف لائے تھے۔ یہ وہ

زمانہ تھا جب کشمیر میں شہمیری خاندان کے مشہور اور ہر دلعزیز سلطان زین العابدین بڈشاہ عناں گیر تھے۔

جناب میر سیّد حسین قمیؒ فرقہ اثنا عشریہ کے ایک جیّد عالم اور صاحبِ کشف و کمالات تھے۔ تبلیغِ دین اور رُوحانیت پر دسترس رکھنے کے پیشِ نظر سُلطان زین العابدین نے میر سیّد حسین قمیؒ کو اپنے ذاتی مصارف کیلئے تحصیل سوپور کے علاقۂ زینہ گیر کا ایک گاؤں سیدہ پورہ[1] بطور جاگیر عطا کیا۔ وادی خاص کر شمالی کشمیر میں شیعہ مسلک کی اشاعت میں جناب میر نے جو رول ادا کیا ہے وہ یہاں کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ سیّد حسین قمیؒ کا جب وصال ہوا تو اُنہیں سیدہ پورہ کے گاؤں میں ہی آسودہ کیا گیا، جہاں اُس دور سے آج تک اُن کی زیارت مرجعِ خلائق بنی ہوئی ہے۔

میر سیّد حسین قمیؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد اُن کے انصار مُلّا عالم کا جب سیدہ پورہ میں ہی انتقال ہُوا تو اُن کو اس گاؤں سے شمال کیطرف تین کلومیٹر کی دُوری پر واقع موضع براٹ میں سُپردِ خاک کیا گیا۔ اُن کا مزار آج بھی وہاں صحیح حالت میں ہے اور اس کے چاروں طرف دیوار بندی ہے۔ مولانا محمّد جواد اپنی حیات میں جب بھی سیّدہ پورہ آتے تو وہ مُلّا عالم کی قبر پر ضرور حاضری دیا کرتے تھے۔

---

[1] قصبہ سوپور کے شمال و جنوب میں ۱۱ کلومیٹر کے فاصلے پر فرقہ اثنا عشریہ کی ایک مشہور بستی جہاں سال بھر زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

شہمیری خاندان کے زوال کے بعد جب کشمیر میں چک خاندان برسرِ اقتدار آچکا تو یہاں سیاسی بے چینی میں جو اصل میں شہمیری خاندان کے آخری دو تین سلاطین کے دورِ حکومت میں اُن کی نااہلیت کی وجہ سے پیدا ہو چکی تھی اور بھی اضافہ ہُوا۔ اِس بے چینی کے نتیجے میں چکوں کے ۲۷ سالہ دورِ حکومت میں مجموعی طور پر سیاسی اُتھل پُتھل ہی رہی۔ اُدھر سے چغتائی خاندان کا مضبوط اِرادوں والا بادشاہ اکبرِ اعظم کشمیر کو اپنے قبضے میں میں لانے کیلئے مُدّتوں للچا رہا تھا اور جب یہاں کی کئی سرِ برآوردہ شخصیتوں کی دعوت پر اکبرِ اعظم کشمیر کو اپنے زیرِ نگین لانے میں کامیاب ہُوا اور اس کا خواب پوری طرح شرمندۂ تعبیر ہو چکا تو یہاں شیعہ سُنی فرقوں کے درمیان منافرت کی آگ کو باہری عوامل نے ایسے بھڑکا دیا کہ بقولِ مورّخ حسنؔ "تاراجِ شیعیانِ کشمیر" کی عملی صورت دیکھنے میں آنے لگی۔ اِس گھناؤنے سیاسی کھیل کے نتیجے میں اُن جگہوں سے شیعہ فرقہ کے لوگوں کا انخلاء ہونے لگا جن پر وہ اقلیت میں تھے۔ نتیجتاً ملّا عالم کا بیٹا ملّا محمد بھی علاقۂ زینہ گیر کے موضع براٹھ سے نقل مکانی کر کے ماگام علاقہ کے احمد پورہ گاؤں میں، جہاں فرقۂ اثنا عشریہ کے کئی صالحین اور متقین مدفون ہیں، عارضی طور آباد ہو گیا اور آخر کار ملّا عالم کے بیٹے ملّا محمد کو اس گاؤں کی مٹی نے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔ اُن کے پوتے ملّا فضل علی ایک جامع کمالات بُزرگ بن کر آئے اور اُنہوں نے وادی میں جعفری مسلک کی اشاعت، پھیلاؤ اور مذہبی

خِدمات میں وہ کارہائے نُمایاں انجام دیئے جن سے کہ اِس مذہبی خانوادے کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

مُلّا فضل علی نے موضع احمد پورہ کے پڑوس والے گاؤں تانترے[1] پورہ کے مُلّا محمد مقیم سے دینی تعلیم پانے کے بعد یہاں کے مذہبی عالموں میں اعلیٰ ترین درجہ حاصل کرلیا اور سرینگر کے کئی روساء[3] کی تحریک پر احمد پورہ سے ہجرت کر کے خانقاہ سوختہ نواکدل کو اپنا مُستقل مُستقر بنالیا۔ مولانا فضل علی اپنے وقت کے دیدہ ور مذہبی عالموں میں شُمار کئے جاتے تھے اور ساری عُمر مذہبی خِدمات انجام دینے کے بعد ۱۲۶۳ھ میں واصل حق ہوئے۔

مُلّا فضل علی صاحب کے پانچ بیٹے مُلّا محمد جواد[2]، مُلّا عبدُاللہ[3]، مُلّا محمد صادق[4]، مُلّا عباس اور مُلّا محمد حسین ہوئے۔ اِن میں سے مُلّا عباس کے دُو بیٹے مُلّا مُصطفیٰ اور مُلّا عبدُاللہ ہوئے۔ مُلّا مُصطفیٰ کے ہُونہار فرزند مُلّا حیدر علی کو کشمیر کی مذہبی شخصیتوں میں ایک باکمال ہستی مانا جاتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے جہاں ایک رخشندہ سِتارہ کی حیثیت رکھتے تھے وہاں وہ شیعہ قوم کے مصلح بھی تھے۔ اپنے والد مُلّا مُصطفیٰ سے اِبتدائی مذہبی تعلیم پاکر عراق تشریف لے گئے جہاں اُنھوں نے حوزۂ علمیہ نجفِ اشرف میں کئی سال رہ کر مذہبی تعلیم حاصل کرنے میں مہارت تامہ پائی اور وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد وادی میں مذہبی تبلیغ، وعظ و نصیحت اور دینی خِدمات

سے ۱ ہانجی ویرہ ماگام روڈ کے دائیں کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں۔

سے ۲ متوفی ۱۲۸۱ھ ۳ متوفی ۱۲۹۹ھ ۴ متوفی ۱۲۹۸ھ

کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ مُلّا حیدر علی کے پانچ بیٹے ہوئے جن
میں مُلّا فضل علی، مُلّا محمّد صادق، مُلّا محمّد عباس، مُلّا محمد جوّاد اور مُلّا عبدالعلی
حضر ایں خانہ تمام آفتاب است کے مصداق باکمال لوگ گزرے ہیں۔
مُلّا فضل علی نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے ہی والد مُلّا حیدر علی
سے حاصل کی اور مزید تعلیم پانے کیلئے عراق چلے گئے۔ وہاں سے
واپس آکر وہ بھی تبلیغِ دین میں مصروف رہے۔ آپ کے چار فرزندوں
میں مولوی فدا علی محکمہ صحت عامہ کے ساتھ وابستہ رہ کر ۱۹۸۶ء
میں انتقال کر چکے۔ دوسرے فرزند مولوی مقصود حسین ایکسائز اینڈ
ٹیکزیشن محکمے میں ایک کلیدی عہدہ پر رہ کر دورانِ مُلازمت ہی
وفات پا چکے۔ مولوی عاشق حسین، عدلیہ کے محکمہ سے منسلک ہونے
کے بعد تقسیمِ مُلک کے موقعہ پر پاکستان چلے گئے اور تب سے
وہاں ہی سکونت پذیر ہیں اور مولوی حسن علی صاحب جو عرصہ دراز
سے صاحبِ فراش ہیں، ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ اِن ہی کے فرزندِ
ارجمند مولانا محمّد عباس انصاری عالم دین ہونے کے علاوہ آج کل
صدر اتحادُالمسلمین بھی ہیں اور یہاں کی سیاست میں خاص رول
ادا کرتے آئے ہیں۔ مولوی حسن علی کے دوسرے صاجزادے
مولوی مصطفیٰ حسین انصاری ایک جواں سال اور شعلہ بیان مبلغ
دین مانے جاتے ہیں اور کئی کتابوں کے مُصنّف ہیں۔
مُلّا حیدر علی کے دوسرے چار فرزندوں میں مُلّا محمّد جوّاد
اس گھرانے کے وہ فردِ واحد ہیں جنہوں نے اپنے دینی و تبلیغی
خاندان کو دُوسری طرح سے استحکام بخشا اور اپنے اسلاف کی

رِوایتوں کو برقرار رکھنے کے علاوہ فلاحی کام کر کے کارہائے نُمایاں انجام دیئے۔ مولانا موصوف کی وِلادت ۱۵ صفر المظفر ۱۳۱۴ھ کو اپنے آبائی مستقر خانقاہ سوختہ نواکدل میں ہوئی اور اپنے والد مُلّا حیدر علی صاحب سے مروجہ عربی و فارسی تعلیم حاصل کی۔ ابھی آپ کی عمر ۱۹ سال ہی تھی کہ والد کے سایہ سے محرُوم ہوگئے اور اپنے برادرِ اکبر مُلّا افضل علی صاحب سے اپنی دینی تعلیم کو دُرست کرلینا شروع کیا۔ لیکن تین۳ سال گزرنے کے بعد اُن کا بھی جب انتقال ہُوا تو آپ نے موضع اِسکندر پورہ تحصیل بیروہ کی ایک باکمال رُوحانی شخصیت اور عالم دین شیخ علی اصغر صاحب مجتہد العصر جنہیں عُرفِ عام میں "شیخ صاحب" کہا کرتے تھے، کی طرف رجُوع کرلیا۔ علامہ شیخ صاحب عراق کے شہر نجف اشرف کے حوزۂ علمیہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے ناطے وہاں ۳۴ سال گزار چکے تھے۔ اس سے خود بخود اندازہ ہوگا کہ شیخ علی اصغر مرحُوم کِس درجہ کے عالمِ دین تھے۔ مُلّا محمّد جوّاد صاحب نے تعلیم سے فراغت پانے اور اپنے آپ کو دینی امورات پر حاوی کرانے کے بعد تبلیغ دین کی طرف توجہ دینا شروع کرلیا اور اس سے قطع نظر قومی و سیاسی کاموں جِن کی طرف آپ کا زیادہ جھکاؤ تھا میں بھی دِلچسپی دِکھانے لگے۔ چنانچہ غیر ذِمہ دار نِظام حکومت میں مولانا محمّد جوّاد کو شیعہ ٹکٹ پر یہاں کی قانون ساز اسمبلی میں ایک ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا گیا اور اس اسمبلی میں کئی سال تک قوم کی نُمائندگی کرتے رہے۔

مرحُوم شیخ محمّد عبداللہ کی قیادت میں جب یہاں تحریک

آزادی کا آغاز ہوا تو مُلّا محمد جواد نے یہاں کی شیعہ آبادی کے ایک حصّے کو تحریک حُریت کا حِصّہ دار بنانے کے لیئے اُن کی رہنمائی کرنے کی ذِمہ داری سنبھالی۔ اپنے مقلدوں کو شیرازہ بند کرنے کے سلسلے میں مولانا نے ۱۹۳۳ء کے دوران آل جموں وکشمیر شیعہ ایسوسی ایشن کی بُنیاد ڈال دی اور خود اس ایسوسی ایشن کے پہلے صدر ہوئے۔ اس ایسوسی ایشن میں فرقہ شیعہ کے وہی لوگ آئے جو مُلّا محمد جواد کے خاندان کے مُرید ہیں۔ شیعہ برادری کا دُوسرا حِصّہ بڈگام کے آغا سیّد یوسف الموسوی الصفوی مرحُوم و مغفور کے خاندان کے عقیدتمند مانے جاتے ہیں اور اُن کی مذہبی تنظیم انجمن شرعی شعیان آل جموں وکشمیر فرقہ جدید کے نام سے موسوم ہے، جبکہ شیعہ ایسوسی ایشن کی انجمن سے وابستہ جماعت فرقہ قدیم کہلاتی ہے۔

مولانا محمّد جوّاد کے اقتدار تک سرینگر کا چار سو اُنا سٹھ (۴۵۹) سالہ قدیم حُسینیہ یعنی اِمام باڑہ جڈی بل (سرینگر) شہر اور دیہات کے کئی سربرآوردہ رئیسوں اور جاگیرداروں کے انتظام و انصرام و تحویل میں تھا مگر مولانا موصوف نے اس اِمام باڑہ کو اُن روٗساء کے تصرف سے چھُڑا کر ۱۹۳۴ء کے دوران شعیان کشمیر کے ایک حِصّہ کا اوقاف معرض وجُود میں لایا۔ اِس اِمام باڑہ کے انتظام سے متعلق ایک انتظامیہ کمیٹی بھی تشکیل دی جس کے آپ خُود صدر بنے۔ اِمام باڑہ کو اوقاف کی تحویل میں لینے کے فوراً بعد مولانا نے لگ بھگ ایک لاکھ رُوپیہ اِس کی مرمت اور تزئین و آرائش پر خرچ کیئے۔

امام باڑہ جڈی بل سے قطع نظر مولانا موصوف نے علاقہ ماگام میں احمد پورہ کے گاؤں میں ۱۹۵۳ء کے دوران تین لاکھ روپے کی لاگت سے جدید طرز کا ایک اور امام باڑہ تعمیر کرایا، جو امام باڑہ بڈگام، جڈی بل اور حسن آباد کی طرح جدید دور کا ایک تاریخی امام باڑہ ہے۔ فلاحی اور دینی کاموں کے سلسلے میں مولانا صاحب نے جڈی بل میں نماز عیدین کے لئے ایک وسیع پارک کی بنیاد ڈالی جسے علی پارک کا نام دیا گیا ہے۔ سرینگر کے خانقاہ معلیٰ کے ساتھ ہی محلہ تمچہ بل میں عاشورہ کے جلوس میں نکالے جاتے ذوالجناح کے لئے ایک عارضی قرار گاہ تعمیر کرائی۔ اسی طرح نالہ مار روڈ پر محلہ کمانگر پورہ میں ایک قطعۂ زمین حاصل کر کے وہاں بھی ذوالجناح گاہ بنوایا۔ امام باڑہ جڈی بل کے ارد گرد جگہ کی زبردست تنگی کے باعث مجالس حسینی اور جلوس عاشورہ کے موقعہ پر زائرین کو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس مشکل کو دور کرنے کے سلسلے میں مولانا نے اہالیان محلہ سے اُن کے آبائی مکانات وہاں سے اُٹھوا کر ایک وسیع رقبہ خرید کر کے امام باڑہ کے بیرونی احاطے کو وسعت دلائی اور شیعہ ایسوسی ایشن کے اوقاف کے تحت علمگری بازار میں کچھ زمین خرید کر کے اُس پر دکانیں تعمیر کروائیں۔ اپنے آبائی مستقر خانقاہ سوختہ کی تباہ حال مسجد شریف کی مرمت اور تجدید کے علاوہ وہاں ایک حمام بھی تعمیر کروایا، جس کی بالائی منزل کو مسافروں کی سہولت اور اُن کی اقامت کے لئے مسافر خانہ کی صورت دی گئی۔ ماگام علاقے میں موضع جیک میں زیارت سید محمدؒ کے مقبرہ پر تعمیر شدہ خستہ حال

چوبی قبّہ کو رقمِ کثیر سے از سرِ نو تعمیر کروایا اور اسطرح مولانا موصوف
دینی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ فلاحی اور ملّی کاموں کے
لئے بھی اپنی ساری زندگی کو وقف کر چکے تھے۔

مولانا مرحوم ایک معاملہ فہم، صاحبِ تدّبر اور سریع فہم
مذہبی ملّی، سیاسی و قومی شخصیّت تھی۔ مزاج بہت ہی متین پایا
تھا اور طبیعت میں سنجیدگی اور متانت کے جوہر تھے۔ اعتدال
پسندی اُن کی گھٹی میں تھی۔ مولانا نے اپنی فہم و فراست سے
کئی ایسے اُلجھے ہوئے قومی مسلوں کو سُلجھا کے رکھدیا جو برس ہا
برس تک فرقہ اثنا عشریہ میں باعث نزاع بنے ہوئے تھے۔
کسی محفل میں جب آپ بولتے یا وعظ خوانی کرتے تو اپنے
اخلاقِ حمیدہ سے لوگوں کے دِل جیت لیا کرتے تھے۔ قوم کی
فلاح و بہبُود اور ملّی خدمات کا جذبہ اِن میں کوٹ کوٹ کر بھرا
ہُوا تھا۔ آپ اپنی پسماندہ قوم کی مذہبی، سیاسی اور اقتصادی
حالت کو سُدھارنے کے سِلسلے میں مرتے دَم تک کام کرتے
رہے اور آخر کار ۴ جمادی الاوّل ۱۳۷۷ھ مُطابق ۲۷ نومبر ۱۹۵۷ء
بعمُر ۶۳ سال بعارضۂ فالج داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے اور حڈی بل
کے تاریخی قبرستان باباؔ مزار میں اپنے والد بُزرگوار مُلّا حیدر علی مرحُوم
کے پہلو میں سپُرد خاک کئے گئے۔ وہ اپنے پیچھے پہلی بیوی سے
ایک بیٹا مولوی شوکت حُسین اور دُوسری بیوی سے مولانا افتخار حُسین
انصاری، مولوی عابد حُسین، مولوی امجد حُسین اور دو لڑکیاں چھوڑ گئے۔
کشمیر کے اُردو شاعر ایک چ پوری صاحب نے مولانا کا مادّۂ تاریخ

اس شعر سے نکالا ہے ؎

سالِ رحلتش گفتم اکبر با "آہِ دل"
سوئے خلد محمّد جواد راہی شُد

۴۰ + ۱۳۳۷ = ۱۳۷۷ ھ

منشی محمّد صادق مرحوم مدرس اورینٹل کالج، باغ دلاور خان، سرینگر نے بھی ذیل کے شعر سے مولانا موصوف کا سالِ وفات برآمد کیا ہے ؎

شمعِ دینِ حق گُل از بادِ اجل شُد ہائے ہائے
صادقا برگو ہمیں با نالہ ہائے وائے وائے

۲۷۱ + ۹۶۷ + ۱۳۹ = ۱۳۷۷ ھ



سیّد رسول پونپرؔ

کُندن لال سہگل!

جموّں کی سرزمین اِس لحاظ سے بھی خوش بخت ہے کہ یہاں کی مٹّی سے پیدا ہونے والی مُمتاز شخصیّات میں ایسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے مُصوّری، اَدب اور موسیقی جیسے فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں نُمایاں کارنامے انجام دِئے ہیں۔ اِنسانی سماج کی قدیم ترین رِوایات میں موسیقی کو نہایت ہی اہم مقام حاصل ہے، جس کا اگر حیات اور کائنات کے حوالہ سے بھی مُطالعہ کیا جائے تو مناسب ہوگا کیونکہ نظم و آہنگ کے بغیر اِس رنگا رنگ اور وسیع زِندگی کا وجود ہی ناممکن ہے۔ پھر اگر کِسی اِنسانی وجود کی گُتھی میں اللہ کی عنایت سے موسیقی کا غالب عنصر شامل ہوا ہو تو اُس مُقدر کا کیا کہنے کیونکہ ؎

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست

اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ فرمانرواؤں اور حُکمرانوں کی سرپرستی سے بھی اپنے وقت کے صفِ اوّل کے موسیقار اور گلوکار کلا کے اُفق پر چمکے لیکن یہاں بھی بُنیادی اہمیّت اُن کے فانی وجود

میں فن کی لامتناہی اور لافانی خداداد صلاحیتوں کو اوّلیت حاصل ہے۔ ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

جموّں ہی کے اُماوت شرما کے فرزندِ ارجمند جناب شِو کمار شرما نے کشمیر کی صوفیانہ موسیقی کے بُنیادی کلاسیکی ساز سنطور کو ساری دُنیا میں متعارف کرایا۔ اِس طرح اُنہوں نے نہ صِرف جموّں کشمیر نام کو روشن کیا بلکہ اپنی بے پناہ اختراعی اور تخلیقی صلاحیتوں کا صفِ اوّل کے سنطور نواز کی حیثیت سے ساری دُنیا میں لوہا منوایا۔ صوفیانہ موسیقی کی حدود سے سنطور کو نِکال کر دُنیائے موسیقی کے مُسلمہ سازوں کی پُرسوز محفل میں شامل کر کے شِو کمار شرما نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ملکہ پوکھراج جو اَب پاکستانی شہری ہیں اور جو ۱۹۸۸ء میں دورہ ریاست جموّں وکشمیر پر آئی تھیں، ۱۹۴۷ء سے پہلے فِضائے موسیقی کو اپنی مترنم اور پُرسوز لے سے مہکاتی رہیں۔ یہاں کے شاہی دربار سے ملکہ پوکھراج کے قریبی روابط کوئی ڈھکی چُھپی بات نہیں۔ چونکہ فن جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اس لئے ملکہ پوکھراج ہمسے دُور ہو کر بھی ہمارے دِل کی دھڑکنوں میں موسیقی کی لہروں کی صورت موجود ہے۔ اِس ضمن میں طبلہ نواز اُستاد اللہ رکھا خان، جنہیں طبلہ نوازی کے فن کے میدان میں قابلِ قدر خدمات کے اعتراف میں جموّں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے فروری ۱۹۸۹ء میں فیلوشپ عطا کیا گیا، کا ذِکر کئے بغیر یہ مضمون ادھورا رہے گا۔

یہ سبھی چوٹی کے فنکار جموّں سے ہجرت کرنے کے باوصف ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمارا سر اُنکا نام لیتے ہوئے اُونچا رہتا ہے۔ جموّں کی مردم خیز مٹی کے بارے میں بھی علامہ اِقبال کا یہ شعر حرف بحرف صحیح ہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اِس تمہید کے بعد اب آئیے ذرا بڈیالی برہمنہ، رنبیر سنگھ پورہ جموّں (نواشہر) کے اداکار، گلوکار اور مقبول ترین فلمی کلاکار کی مُختصر، پُرخطر، پُرشوق اور پُرمعنی زندگی پر نظر ڈالیں جو ۱۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو صرف بیالیس (۴۲) سال کی عمر میں اِس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے لاکھوں مداحوں کو سوگوار چھوڑا۔ میری مُراد سرگباشی کُندن لال سہگل سے ہے جن کی زندگی موسیقی اور فن سے عبارت تھی جس کے لئے وہ بچپن ہی سے ہر چھوٹی بڑی مُشکل کا گھر اور گھر سے باہر ڈٹ کر مُقابلہ کرتا رہا جب تک اُس کے خوابوں کی دُنیا آباد ہوئی اور جب تک فلمی دُنیا کے مقبول ترین ستارہ کی حیثیت وہ فن کی بُلندیوں کو چھُونے میں کامیاب ہوا۔ وہ ازل سے لااُبالی طبیعت اور سوز و ساز لے کر آئے تھے، جس کا کُندن لال سہگل نے بھرپور اور ہر مُمکنہ حد تک استفادہ کیا، یہی اَبدی مسرّت کا سامان ہے جو ایک فنکار کو کسی طور چاہیئے۔

ایسے فنکار بہت کم ہوتے ہیں جن کے سر اُنکے جیتے جی وقت شہرت کا تاج رکھتا ہے۔ کُندن لال اُنہی معدودے چند خوش بختوں میں سے ایک ہے جس نے اپنے فن کا سورج اپنی آنکھوں سے

بامِ عروج پر چمکتا دیکھا اور جو اپنی زندگی میں ہی داستان بن گیا تھا۔ سازو آواز کا یہ زائر اپریل ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا جب ریاست جموں و کشمیر پر، پرتاپ کا راج تھا۔ کُندن لال سہگل کے والد تحصیلدار تھے جو ریٹائر ہونے کے بعد جالندھر چلے گئے اور وہیں بس گئے۔ ننھا سہگل بچپن ہی سے موسیقی کا رسیا تھا۔ یہیں سے اُس کی زِندگی کا کٹھن سفر شروع ہوتا ہے۔ موسیقی سے لگاؤ رکھنے اور گانا بجانے والوں کو سماج میں اچھّی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ شاید یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ موسیقی کا فن ملک بھر میں اگلے وقتوں سے مذہب اور دھرم کے سایہ میں پروان چڑھا۔ ننّھے سہگل کے وقت بھی موسیقی کے بارے میں بات برملا نہیں، کہی جاسکتی تھی اور لوگ چوری چھُپے اپنا یہ فِطری شوق پورا کرتے تھے۔ سہگل کی ماں کیسر نے اپنے بیٹے کی مخفی صلاحیتوں کو پہچان لیا تھا جس نے اُسکے فِطری شوق کو جِلا بخشی۔ وہ ہیر کے گیت گُنگُناتی تو ننّھا سہگل اُسکے سُر کے ساتھ سُر ملا کر جیسے اپنے مُقدّر کو سنوارتا۔ اُسکی پڑھائی مایوس کُن تو تھی لیکن سہگل کی مُشفق ماں کو پکا یقین تھا کہ اُس کا بیٹا اپنے فن سے اُن کا نام روشن کرے گا۔ موسیقی کے اَزلی عاشق اور اُس کی ماں کا بے لوث محبت سے بھرپور رِشتہ کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک موقعہ پر، پریاگ سمتی اِلہ آباد کے زیرِ اِہتمام ایک میوزک کانفرنس کا اِنعقاد کیا گیا تھا۔ اپنے وقت کے سربرآوردہ ماہرینِ فن اور اساتذہ، پنڈت اومکارناتھ ٹھاکر، اُستاد فیاض خان، ڈی وی پلسکر، نارائن راؤ

ویاس اور ونایک راؤ پٹوردھن رونقِ محفل تھے۔ جونہی کُندن لال سہگل ہال میں داخل ہوا تو معززسامعین نے یک آواز ہوکر سہگل! سہگل کی گونج کے درمیان اُس کا گرمجوشی اور محبت سے استقبال کیا۔ ماں کیسر اور اُس کی بیوی آشا رانی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ سہگل نے سادہ سے ہارمونیم پر دیوداس، یہودی کی لڑکی، چاندی داس اور سٹریٹ سنگر فلموں کے وہ گانے گائے جنکو اُس نے اپنی جادو بھری پُرسوز اور مدھر آواز سے اَمر بنایا تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے تقریب اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ فرمائشوں پر فرمائش آرہی تھی کاغذ کے پُرزوں پر لکھ کر فلاں گانا گاؤ، یمن گاؤ، سندھوری گاؤ۔ پھر گاؤ! پھر گاؤ! سہگل سٹیج سے اُتر کر ہال میں آگیا، تالیوں کی گونج میں مسرّت سے سرشار ہوکر ماں کو، اپنے ہاتھوں پر، اپنے سر سے اُوپر اُٹھا کے گھمایا یہ کہتے ہوئے کہ "سُن ماں سُن! یہ لوگ تو میرے لئے آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں کہ میں اُن کے لیئے گاؤں انہیں میرا رُکنا گوارا نہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ میں گلوکار اور موسیقار ہوں"۔ ماں نے ایسا کرنے سے لاکھ منع کیا لیکن وہ کہاں تھا اُس کی بات ماننے والا۔ اُس کی ماں کو ایسا لگا جیسے کہ اُسے اپنے لاڈلے بیٹے کے بارے میں دیکھے ہوئے سپنے سچے لگنے لگے ہوں۔ اُس کے بیٹے کی مدھ بھری آواز نے دُنیا کو گرویدہ بنا دیا تھا۔ اُسے کئی جوتشیوں سے بنائی ہوئی جنم کُنڈلیوں کے مُطابق معلوم تھا کہ وہ تیزی سے اپنی زندگی کے انجام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اُسے جواں مرگ ہونا ہے لیکن اُس سے پہلے اپنی مدھ بھری آواز میں موسیقی کے

سربستہ رازمسروں کو صدا بند کر کے امر بناتا ہے۔

سہگل کا ہر شہر میں جہاں وہ رہا ایک نہ ایک جوتشی تھا، مُراد آباد میں یوگیشور شاشتری، کلکتہ میں بدری پرساد شاستری جسکی لڑکی پوربی کو سہگل نے بھجن اور ہوری گانا سکھایا، جن کے ساتھ سہگل کے ذاتی مراسم تھے۔ دہلی کے نجومی کا نام بشوا ناتھ راج گھڑیا تھا، جو اُن دنوں نئی سڑک کے علاقہ میں رہتا تھا۔ بہ زعم خود مُقدر کے یہ سبھی راز دان سہگل کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بمبئی میں جہاں سہگل نے زندگی کے آخری ایام گزارے، اُس کا کوئی نجومی نظر نہیں آتا۔ شاید اِس لئے کہ اُسے معلوم تھا کہ زندگی خود بھی بلائے ناگہانی ہے۔ نجومیوں سے لینا دینا کیا۔ جیو دو گھڑی اپنی من پسند زندگی اور بس سے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے ناگہانی اور ہے!

جالندھر میں اپنے والد کا گھر چھوڑ کر، رہ نوردِ عشق ہو کر مُراد آباد پہنچ جاتا، جہاں کا قیام اُس کی آئندہ زندگی میں دور رس نتائج کا حامل ثابت ہو جاتا ہے۔ جہاں کا سارنگی نواز امتیاز احمد سہگل کے ساتھ پہلی مُلاقاتوں کا ذکر محبت و شفقت اور فخر سے کرتا ہے۔ اُسے عبدالکریم خان کے گاین کا سارنگی نواز کی حیثیت سے ساتھ دینا تھا۔ اُس کے لئے بھی یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی بڑی اور اہم تقریب میں ایک بڑے کلاکار کا ساتھ دے رہا تھا، وہ بھی جب اتفاق سے عبدالکریم خان صاحب کا اپنا سارنگی نواز کسی وجہ

سے شریکِ محفل نہ ہو سکا۔ اِس پروگرام کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ
مُراد آباد کا فرنگی نژاد سٹیشن ماسٹر بھی یہاں مہمانِ خصوصی کی
حیثیت سے تشریف لانے والے تھے۔ اِمتیاز احمد کے کہنے کے
مُطابق اُسے بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ سٹیشن ماسٹر کی بیوی نے
سہگل کو پڑھنا، لکھنا اور بولنا بھی سکھایا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ
سہگل جسکو اُس نے کئی بار ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا بھی
سامعین میں شامل تھا ایک نہایت ہی دُبلا پتلا نوجوان اپنے
خوابوں اور خیالوں کی دُنیا میں ڈوبا ہوا ہمہ تن گوش تھا۔ سہگل
کُرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے بال ابھی بھی گھنے تھے، لمبے
لمبے، اُس نے اُسے کوئی شاعر سمجھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ ہارمونیم
پر بازار میں گانے والا گلوکار پہلے ہی سر کے بال جھڑ چکا ہے اور
وہ وِگ کے سہارے فِطرت کی اِس ستم ظریفی پر خندہ زن ہے۔
اِس کے بعد ایک دِن سہ پہر کو امتیاز احمد ایک خط ڈاک میں ڈالنے
کیلئے ریلوے پلیٹ فارم پر گیا، جہاں اُس نے اُسی دُبلے پتلے لڑکے
(سہگل) کو ڈاک کی تھیلیوں کے ڈھیرے پر بیٹھا ہوا پایا۔ یہاں بڑی
تنہائی تھی اور دوسری ٹرین گھنٹوں بعد آنے والی تھی۔ مارچ کا مہینہ
تھا جب وہ وہاں سے گُزرا تو سہگل گا رہا تھا۔ اُس نے غور سے
سُنا تو معلوم ہوا کہ سہگل جھنجھوٹی اور ٹھُمری گا رہا ہے، جسکے گائن
میں عبدالکریم خان نے نام پایا۔ امتیاز احمد کا کہنا ہے کہ وہ
حیران اِسلئے نہیں ہوا کہ وہ اپنی دُھن میں مگن گا رہا ہے بلکہ اِسلئے
کہ وہ وہی گانا گا رہا تھا جسکے لئے میں نے چند روز پہلے عبدالکریم

کے ساتھ سارنگی پر سنگت دی تھی۔ سہگل دنیا وفیہا سے بے خبر گا رہا تھا۔ امتیاز احمد انتظار کرتا رہا جب تک سہگل گانا ختم کر چکا۔ اُس نے اُسے اپنے گھر لیا جہاں فضائے بسیط کا نظارہ کرتے ہوئے وہ اُسے پوچھنے لگا۔

"تم نے کس سے یہ فن سیکھا ہے۔"

"کسی سے نہیں۔ دُبلے پتلے لڑکے نے جواب دیا۔"

"لیکن گانا گاتے ہوئے لگتا تھا کہ تم کو فنِ موسیقی پر بڑی دستگاہ حاصل ہے"، امتیاز احمد نے پھر کہا۔"

"یُونہی نقل اُتارتا تھا"، سہگل نے پھر کہا۔"

امتیاز کو اِس بات پر کوئی یقین نہیں آیا۔ اُس نے اپنی سارنگی ہاتھ میں لے لی اور سہگل سے کہا کہ تم کوئی اور گانا گا سکتے ہو؟

صرف کچھ غزلیں اور بھجن۔

امتیاز نے سارنگی کو اپنے فنکارانہ انداز میں چھیڑا اور سہگل سے اصرار کرنے لگا "کچھ تو گاؤنا!"

سہگل نے غالب کی یہ غزل اپنی دردبھری آواز میں چھیڑی ؎

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں [1]

اِس کے بعد سہگل بغیر تیاری کے کامیابی سے گانے لگا۔ اِس کے باوجود کہ وہ کسی گرو یا گھرانے کا تربیت یافتہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ

---

[1] سہگل اُردو کے علاوہ فارسی، پنجابی، بنگالی اور ہندی زبانوں میں پورے اعتماد کے ساتھ گاتا تھا۔

تو الفاظ اور شبدوں میں چھپی موسیقی کا رازدان تھا۔ کے۔ ایل۔ سہگل کے فن اور اُس کی زندگی بامِ عروج تک پہنچانے کے دعویداروں میں بی۔ این۔ سرکار، پنکج ملک، آر۔ سی۔ بورَل، دیوکی بوس اور پھنی مجمدار شامل ہیں۔ بی۔ این۔ سرکار نیو تھیٹرز کا مالک تھا، جو ایک طرح کی فلمی کمپنی تھی۔ اُس نے سہگل کو وہاں پر مُلازم لگایا۔ اب اصل مسئلہ تو تھا کہ اُس کی خداداد فنکارانہ صلاحیتوں کو کیسے معقول طریقہ سے کام میں لایا جائے۔ ایک دِن آر۔ سی۔ بورَل نے سہگل کو نیو تھیٹرز کے آڈیشن روم میں لیا۔ فرش پر بٹھاکر اُسے ہارمیونیم لاکر دیا۔ سہگل نے جونہی اپنے جادو بھرے ہاتھوں سے ہارمونیم کو چھیڑا لوگ اِدھر اُدھر سے آکر اُس کے گِرد جمع ہوئے۔ اُس نے پہلے بھجن گایا پھر غزل بھی گائی۔ راگ یمن اور باگیشوری سے خیال کی جانب لپکا۔ سبھی لوگ ہمہ تن گوش ہوکر سُن رہے تھے۔ اِس طرح نیو تھیٹرز کے ساتھ اُس کی بے پناہ فنی صلاحیتوں کے اعتراف میں اُسکا کام کرنے کا تحریری معاہدہ ہوا۔ اُس کے فن کا سِتارہ اِسطرح اُفق پر نمودار ہوا۔ سب سے پہلے اِس کمپنی کی طرف سے تیار کی گئی فلم "محبت کے آنسو" کے لئے سہگل نے گانے گائے۔ اُس کے بعد "صبح کے ستارے" "زندہ لاش" اور پھر "رامی اور چنڈی" جو نہایت ہی کامیاب رہی، فلموں کو اُس نے اپنی آواز سے سوز و ساز عطا کیا۔ لیکن یہ فِلم "دیوداس" ہی تھی، جسنے سہگل کی خوش بختی کے سارے دروازے کھول دِئے اور اُس نے سدا بہار، نیستان میں قدم رکھا، جہاں سے وہ پھر کبھی واپس نہیں لوٹا ـــــ اِس ضمن میں آر۔ سی۔ بورَل کے پُرخلوص تعاون کو بھی کافی دخل ہے، جس نے سہگل کی گُتھی ہوئی بے پناہ صلاحیتوں کو

بروئے کار لانے کے لئے جتن کئے۔ بنگالی فلم "دیوداس" میں جو گانے سہگل نے گائے اُن کے بول یہ تھے ۔

کہارے سجے جوڈو تھے بچے
گولاب ہوئے اٹھک پھٹے

یہ گانے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت پنکج ملک کو گانے تھے لیکن سہگل کو مختلف صبر آزما مراحل سے گزر کر یہ گانے تجرباتی طور گانے کو ملے۔ اُس نے اِن گانوں کے مطالب، صَدا بند کرنے سے اسلئے بھی سیکھے تاکہ وہ اِن میں چھپی دَدبھری موسیقی کی تہہ تک جا سکے کیونکہ یہ قحبہ خانے کے مخصوص حالات کی آئینہ داری کرتے تھے۔ شرت چندر کے مشورہ پر اسلئے بھی سہگل کی آواز میں یہ گانے گوائے گئے کہ قحبہ خانوں میں صرف بنگالی ہی نہیں بلکہ دُوسری زبانیں بولنے ولاے بھی آتے ہیں۔ سہگل اِسطرح بنگالیوں میں بھی مقبول ہوا اور فلم بھی کامیابیوں سے ہم کنار ہوئی۔ بہت کم لوگوں کو اندازہ ہو سکا کہ گلوکار غیر بنگالی ہے۔ اِسی فلم کے ہندوستانی روپ میں سہگل نے "دیوداس" میں لاثانی اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے کام کیا۔

سہگل کو اپنی مُشفق ماں کی وساطت سے موسیقی کا ماحول نصیب ہوا، نصیب کیا ہوا بلکہ ورثہ میں مِلا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ وہ ابھی دس سال کے سن کو بھی نہیں پہنچ چکا تھا کہ اُس نے جموں کی معمول کی سالانہ رام لیلا تقاریب میں سیتا کا رول نہایت کامیابی سے نبھانا شروع کیا۔ سہگل کا باپ امرچند سہگل سامعین کی اگلی صف میں بیٹھکر ننھے سہگل کی مؤثر اداکاری سے محظوظ ہوتا، دراز قد،

سر پر پگڑی، باصد کرّ وفر بیٹے کا موسیقی اور اداکاری سے اُنس بچپن کے
عارضی دَور کے طور بادلِ ناخواستہ برداشت کر ہی لینے میں عافیت تصور
کرتا تھا۔ چونکہ سہگل پڑھائی لکھائی کی طرف کم ہی دھیان دیتا تھا، اس
لئے اُسے اپنے سخت گیر باپ سے نہ صرف ڈانٹ بلکہ مار بھی کھانا
پڑتی تھی، جسکی وجہ سے سہگل نے اپنے باپ سے دوسرے بھائیوں کی
طرح کسی نت نئی چیز کا تقاضا نہیں کیا۔ جمّوں کے ایک مقامی خداترس
نیک سیرت بُزرگ جناب شیخ[3] سلمان یوسف کی اُس پر پیدائش ہی سے
نظرِ کرم تھی، یہ اُسی کا فیضان تھا کہ سہگل موسیقی کی پُراسرار دُنیا میں
کھو گیا۔ جب اُس کی ماں کیسر کو کچھ نہ سُوجھی تو وہ ننھّے سہگل کا ہاتھ
تھامے سلمان یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُسے سارا ماجرا سُنایا۔
سلمان صاحب نے اُسے ذکر و ریاض میں مگن رہنے کو کہا۔ اُنہوں نے
اُسے یقین دلایا کہ سب کچھ اپنے وقت پر ٹھیک ہوگا۔ تیرہ[13] سال کی عمر
میں اُسکی آواز میں فطری تبدیلی ہوئی، وہ بے سُرا ہوا اور دو[2] سال تک وہ
کوئی گانا نہ گا سکا۔ اُس کے بعد پھر سب کچھ ٹھیک ہوا۔ سلمان یُوسف رح
کی مہربانی جو تھی۔ سہگل خود اپنے ایک دوست علی بُخاری کو بتاتا ہے کہ
وہ باضابطہ بارہ[12] سال کی عُمر میں درویش شیخ سلمان یُوسف رح کے حجرے
میں ایک ٹھنڈی شام کو اُنہی کی نظرِ عنایت سے پیدا ہُوا۔

اِس واقعے کے تین سال بعد سہگل کے والد امر چند سہگل
تحصیلدار کے منصب سے ریٹائر ہوئے اور اُن کا خاندان نواشہر (آر۔
ایس۔ پورہ) جمّوں سے جالندھر چلے گئے جہاں اُنہوں نے مُستقل طور
سکونت اختیار کی۔ امر چند سہگل نے وہاں رہ کر ٹھیکیداری بھی کی اور

خوب پیسہ بھی کمایا۔ سہگل سلمان یوسف کی نظرِ کرم کی آس کا دامن تھا۔
وہ جالندھر کیسے نئے گھر کو خیر باد کہہ کر اپنی خوابوں کی دُنیا آباد کرنے
کی راہ ہولیتا ہے، اُسے بقول حافظ معلوم تھا کہ محبت کی تعمیر میں کوئی
خلل واقع نہیں ہوتی، ورنہ اس دُنیا میں کوئی بھی چیز رہنے والی اور
پائیدار نہیں ہے

خلل پذیر بُود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است!

جالندھر میں سہگل خاندان پنج پیر گیٹ کے قریب آباد ہوا،
جسے اب سہگل محلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دیوانے کی عجیب
وضع بھی دیکھیے کہ سہگل گھر چھوڑ کے جہاں بھی گیا، وہاں جو بھی خط ڈاک
کے ذریعہ ڈالتا، دوسرے شہر جا کر روانہ کرتا، تاکہ اُسکے گھر والوں کو
اُسکی اصلی رہائش کے مقام کا پتہ نہ چلے۔ اس لئے بس افواہیں اُڑتی
رہیں کہ وہ بریلی میں ہے، کانپور، لکھنؤ اور شملہ پہنچا ہے۔ کچھ لوگ
کہتے تھے کہ وہ بہار میں ہے اور کان کن مزدوروں کے ساتھ شامل ہوا
ہے۔ جو اُسے فضول تلاش کرنے چلے، اُنہوں نے آکر کہا کہ وہ فلمی ستاروں
اور اداکاروں کے کاروان کیساتھ مِلکر بمبئی پہنچ گیا ہے۔ کسے معلوم تھا
کہ اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے فلمی دُنیا کے تان سین
کی قسمت کا ستارہ آر۔ سی۔ بورل کی دور اندیش اور دروں بینی پر
مبنی مساعی جمیلہ سے چمکنے والا ہے۔ یہاں سہگل کی حالت یہ تھی کہ

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اِس لئے اُس نے 'محبت کے آنسو' 'صبح کے ستارے' 'زندہ لاش' جیسی فلموں میں سہگل نے کشمیرؔ لال کے نام ہی کام چلایا تاکہ گھر والوں اور اپنے احباب و اقارب کی گرفت سے بچ سکے۔ یہاں پر یہ بتا دینا بے محل نہیں ہوگا کہ کلکتہ کی فلمی کمپنی نیو تھیٹرز میں سہگل کے تقرر کیوقت اُس کی عمر چھبیس ۲۶ سال تھی اور اُس نے اپنے رُوحانی پیر و مرشد شیخ سلمان یوسف کی شاگردی میں بارہ ۱۲ برس سے زیادہ کا عرصہ پورا کیا تھا۔ فلمی اداکاری سہگل کا پیشہ اور موسیقی اُس فانی وجود کا لافانی جوہر۔ لوگوں کو کیا' وہ تو اُسے اداکار ہی کی حیثیت سے جانتے تھے جو گانا بھی گاتا تھا۔ اُن دنوں رواج تھا جو اداکار ہیرو' ہیروئن کا رول نبھاتا وہ خود ہی گلوکار بھی ہوتا تھا۔ سہگل کی طبیعت شاعرانہ تھی اس لئے گانے سے پہلے اشعار میں باندھے الفاظ میں چھپے معانی کی تہہ تک جاتا تھا' تاکہ انجانے میں اُسے نہ خود سے اور نہ شاعر سے زیادتی کی ناقابلِ معافی خطا سرزد نہ ہو۔ موسیقی کا کوئی بھی شائق اور کے۔ایل۔سہگل کا فدوی آج بھی گراما فون کمپنی آف (انجیل لیبل) جن کے کوڈ نمبر نیچے دیئے ہیں رکارڈ حاصل کر کے محفوظ ہوسکتا ہے۔

کوڈ نمبر ای۔اے۔ایچ۔۱۰۰۱'۱۰۰۲'۱۰۰۴

دی گولڈن وائس آف کے۔ایل۔سہگل

وولیوم ۱'۲ و ۳

اِن رکارڈوں میں وہ گانے صدا بند ہیں جو کے۔ایل۔سہگل نے فلموں کیلئے گائے ہیں' جن میں چنڈی داس' یہودی کی لڑکی' پریذیڈنٹ' کاروانِ حیات' دی سٹریٹ سنگر' زندگی' دشمن فلمیں شامل ہیں۔

کوڈ نمبر۔ ایچ۔ اے

گانے جو صدابند ہیں :-

۱۔ لاکھ صحیح پی کی بتیا

۲۔ لگ گئی چوٹ

۳۔ اپنی ہستی کا اگر حُسن نمایاں

۴۔ عشق مجھ کو نہ سہی وحشت ہی سہی

کوڈ نمبر۔ ایل۔ ایچ۔ ۸۔

۱۔ شمع کا جلنا ہے

۲۔ رحمت پہ تیری

۳۔ گھر یہ تیرا سادہ نہ میرا ہے

۴۔ آہ کو چاہیئے اِک عُمر اثر ہونے تک۔

کوڈ نمبر۔ ایل۔ ایچ۔ ۴۰۔

۱۔ ہر اِک بات پہ

۲۔ وہ آکے خواب میں

۳۔ دِل سے تیری نگاہ جِگر تک اُتر گئی

۴۔ بہت اِس گلی میں کِئے

کوڈ نمبر۔ ایل۔ ایچ۔ ۲۶۔

۱۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

۲۔ کون بجھائے راما !

۳۔ نُکتہ چیں ہے غمِ دِل

۴۔ یہ تصوّف اللہ اللہ

ایک طویل ریکارڈ پر سہگل اور پنکج مُلک کے گائے بنگالی گانے صَدا بند کیے ہیں۔ یہ گانے رابندر سنگیت پر مبنی ہیں اور ٹیگور کے نام نذر کئے گئے ہیں۔ ہندوستان میوزیکل پروڈکٹس کا کوڈ نمبر ہے ایل۔ ایچ۔ ایکس۔ ۸، کچھ گانوں کے بول یہ ہیں:۔

۱۔ آمی تومے جاتو

۲۔ اِکتکو چھونیا لاگے

۳۔ تو مار بنائے گان چھلو

۴۔ آج کھیلا بھنگار کھیلا

۵۔ آدِن آجی کون گھرے گو

یہ رِکارڈ پنکج مُلک کے پانچ اور سہگل کے چھ گانوں پر مُشتمل ہے۔ دوسرا بنگالی گانوں پر مُشتمل رِکارڈ جو بہت ہی اہم ہے اور جسے بھُلایا نہیں جاسکتا، ہندوستان رِکارڈ، ایکسٹنڈِڈ پلے۔ ایل۔ اے۔ ۶۹ ہے۔ گانوں کے بول یہ ہیں :۔

۱۔ اے پییے چھِ اَنُن جلا

۲۔ نا یبا گھُمالے پریو

۳۔ جامھن رو بونا اَمی

۴۔ بھاندھنو، مِچھے گھر

کے۔ ایل۔ سہگل کی فنکارانہ شخصیت کو پَروان چڑھانے میں ہندوستانی موسیقی کی لوک اور کلاسیکی رِوایات کا بڑا ہاتھ ہے، جن کی جڑیں اُسکی مُشفق ماں کی گود میں پیوست تھیں۔ وہ جہاں بھی گیا اُس نے اپنے شوق کی تشنگی کو دُور کرنے کیساتھ ساتھ اُس کو

بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس کا تو بقول غالبؔ یہ رویہ رہا ہے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

سہگل کی زندگی اور اُس کے فن کا جائزہ لینا اِس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، خاص کر جب کہ معقول مواخذ کا فقدان ہو۔ البتہ یہ بات بلا تامّل کہی جا سکتی ہے کہ سہگل کی شخصیت اور فن میں فطری سادگی تھی، جو اُس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ بنی کیونکہ یہی وہ بظاہر آسان چیز ہے جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ سہگل کو ہمیشہ اِس بات کی کسک رہی کہ وہ کسی گھرانے یا بڑے اُستاد کا تربیت یافتہ شاگرد نہیں۔ اِسے ایک بے بُنیاد نفسیاتی اُلجھن کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ایک موقعہ پر اُسکی مُلاقات آفتابِ موسیقی جناب فیّاض خان صاحب سے ہوئی۔ اُس نے راگ درباری میں خیال پیش کیا۔ جناب فیّاض خان صاحب نے سُن کر فرمایا "برخوردار! اب کوئی چیز نہیں جو میں تم کو سِکھاؤں اور تم بڑے موسیقار ہو۔ تمہارا فن تکمیل کے آخری مرحلہ میں ہے۔ سہگل ذیابیطس کا مریض تھا۔ اوائل عمر ہی سے پھوڑے پھنسیوں سے اُسکا سارا بدن بہت دُکھتا تھا، وہ شدید درد سے کراہتا رہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس کو شراب نوشی نے مارا۔ آخر کار وہ جگر کے عارضہ میں مُبتلا ہوا، اسطرح ہم سے ہماری دُنیائے موسیقی کا مقبول ترین گلوکار بے وقت اور جواں سالی میں جُدا ہوا۔ اُس نے فن سے محبت کی۔ زندگی سے محبت کی۔ وہ اِنسان کو بلا لحاظ مذہب و ملّت اور رنگ و نسل پیار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ موت سے بھی محبت کرتا تھا۔ زندگی کے آخری ایّام میں وہ ہر شام بمبئی کے شمشان گھاٹ پر جا کر کچھ

وقت وہاں گزارتا۔ شاید وہ اپنی زندگی کے انجام کو جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر غالب کا یہ شعر بھی گنگناتا تھا ۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

سہگل کے خاندان کے تفصیلی حالات اور اُسکے لواحقین[1] کے بارے میں مزید جانکاری حاصل کرنے کی خاطر تحقیق و جستجو کی کافی گنجائش ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سہگل کے آبائی گاؤں اور یہاں جموّں میں اُسکے نام یادگاریں قائم کی جائیں تاکہ سہگل کے فن اور زندگی سے بے پناہ محبت کا مشن جاری رہے کیونکہ وہ نہ صرف عشق ہونے کے ناطے ہمارے درمیان موسیقی کے پُراسرار اور دلرُبا نغموں کی صورت موجود ہے، گو کہ اُسکا جسم اس پیاری اور انوکھی دُنیا سے اُٹھ چکا ہے، کیونکہ زندگی کا بھرم ایسے ہی دیوانوں سے قائم ہے، بقولِ حافظ سہ

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شُد ز عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اُن کی موت کے تینتالیس[43] سال بعد بھی ہمیں یہ توفیق کہاں نصیب کہ ہم سہگل کو ڈوگرہ تسلیم کرائیں۔ بیرونِ ریاست محققوں کی نظر میں وہ تو ابھی تک پنجابی نژاد ہے۔ سہگل کے فن نے یہ سبھی حد بندیاں پھاند لی ہیں لیکن جب ماں ہی اپنے بچّے کو گود نہ لے تو اُس سے بڑھکر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے۔

---

[1] سہگل کے دو داماد علی اور مہندر چوپڑا کے بس نام معلوم ہیں۔ باقی احبابِ خانہ کے بارے میں ابھی تک معلومات دستیاب نہیں۔

مصوّر جامی رائے بوکے ایل۔ سہگل کو نیو تھیٹرز کلکتہ میں ابتداء ہی جانتے تھے کے الفاظ ہیں وہ ایک ایسا اچھوتا اعلیٰ اور سادہ کردار تھا[1] جس کی توضیح کے لئے عام انسان قاصر ہے اُسے ایک ایسا پیکر مان لیجئے جو کسی مقدّس پیشہ سے پھوٹ پڑا ہو، دُنیا و فیہا اور اپنے آپ سے بے خبر کسی لائن ڈرائنگ کی مانند ہے[2]

سلہ اُردو کے ممتاز کہانی کار اور ادیب جناب رام لعل اپنے پاکستان کے سفرنامہ "زرد پتوں کی بہار" میں لکھتے ہیں کہ پاکستان میں کے۔ایل۔ سہگل کے ایک مسلمان فدوی نے سہگل کے گائے گانوں پر مشتمل سبھی گراما فون ریکارڈ اور اُن سے متعلق مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ جملہ اطلاعات پر مبنی نجی لائبریری قائم کی ہے۔ اُسی طرح جسطرح اپنی والہانہ محبت کا اظہار ایک ہندوستانی غیر مسلم اپنی دوپہر کی چائے مولانا ابو الکلام کی قبر پر حاضری دیتے ہوئے روزانہ چائے نوشی سے کرتے ہیں۔

سلہ اس مضمون کی تیاری میں میں نے جناب راگھو آرین کی انگریزی کتاب "کے۔ ایل۔ سہگل" سے بھی استفادہ کیا ہے۔



لالہ ملک راج صرّاف

لالہ ملک راج صرّاف کا نام لیتے ہی میرا سر تعظیماً جھک جاتا ہے کیوں کہ یہی وہ شخصیت تھی جس نے میرا مستقبل استوار کیا۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۸۹ء تک کے باسٹھ سال کے طویل عرصہ تک راقم الحروف صرّاف صاحب کا صحافت کے میدان میں ہمسفر رہا۔

لالہ ملک راج صرّاف کا جنم ۸، اپریل ۱۸۹۴ء کے روز سانبہ (ضلع جموّں) میں ہوا۔ اُن کے والد بزرگوار لالہ دیا رام صرّاف ایک معزز مہاجن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لالہ صاحب کے دادا لالہ کالو شاہ قصبہ کے ایک صاحب رسوخ شخص تھے اور صرافی کا کاروبار کرتے تھے۔ اِسی کاروبار کی وجہ سے اِن کا خاندان صرّاف کے نام سے مشہور ہوا۔ لالہ ملک راج صرّاف کے والد نے صرافی کا کاروبار چھوڑ دیا اور بزازی اور کریانہ کا کاروبار کرنے لگے۔ لالہ ملک راج اپنے پتا کی چوتھی اولاد تھے۔ ۱۹۰۰ء میں سانبہ میں پلیگ کی وبا پھیلی اور اُن کے والد بزرگوار اور دو بڑے بھائی

لقمہ اجل بن گئے۔ اس وقت صراف صاحب کی عُمر سات برس تھی۔ کچھ ہی سال بعد ان کی ماتا اور چھوٹا بھائی بھی سرگباش ہو گئے۔ اس طرح بچپن میں ہی آپ مہر مادری اور شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ صرف ایک بڑا بھائی رہ گیا جو عُمر میں چار سال بڑا تھا اور جس کا نام لالہ کرم چند صراف تھا۔ اسی کے سایۂ عاطفت میں لالہ مُلک راج صراف نے پرورش پائی۔

لالہ مُلک راج صراف نے اِبتدائی تعلیم سانبہ کے ہائی سکول میں حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست کے سکولوں کا اِلحاق پنجاب یُونیورسٹی سے تھا اور وہ ہی مِڈل، انٹرنس، ایف۔اے اور بی۔اے کے اِمتحانات لیا کرتی تھی۔ صوبہ جموّں میں مِڈل کے اِمتحان کا ایک ہی سنٹر جموّں شہر میں تھا اور دُور دراز سے طلبا پیدل سفر کر کے جموّں شہر آیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں لالہ مُلک راج صراف نے مِڈل سکول کا اور اس کے دو سال بعد میٹرک کا اِمتحان پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں پرنس آف ویلز کالج جموّں میں داخلہ لیا۔ کالج ہوسٹل میں ہی رہائش رکھی۔ کالج کی زندگی کے متعلق صراف صاحب نے My College Days (میرے کالج کے ایّام) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں آپ نے نہایت دِلچسپ باتوں کا اِنکشاف کیا۔ مثلاً:

"کالج کے اخراجات بھی آج کل کی طرح نہ تھے۔ دو رُوپے کالج فیس۔ ایک رُوپیہ کھیلوں کی فیس۔ دس رُوپے ہوسٹل میں خوراک کا خرچ۔ دو رُوپے مُتفرق

خرچ یعنی کل پندرہ روپیہ ماہوار خرچ تھا۔ چار روپے ماہانہ وظیفہ مِلا کرتا تھا اور باقی گیارہ روپے ماہوار میرے بڑے بھائی لالہ کرم چند صرّاف دیا کرتے تھے۔"[1]

لالہ صاحب نے کالج کی لائبریری اور ریڈنگ رُوم کا خوب اِستفادہ اُٹھایا۔ فالتو وقت ہمیشہ ریڈنگ رُوم میں گزُارتے۔ اِس کا تذکرہ آپ نے خُود اِن الفاظ میں کیا ہے:

"لائبریری کی کتابیں اور ریڈنگ رُوم میں پڑے اخبار اور میگزین دیکھ کر دِل خوش ہوتا تھا۔ سِول اینڈ مِلٹری گزٹ ٹریبیون، اِلسٹریٹِڈ ویکلی آف اِنڈیا۔ ماڈرن ریویو اور اِنڈین ریویو مزے لے لیکر پڑھا کرتا تھا۔"[2]

اِن ہی دِنوں لالہ صاحب نے کالج کی میگزین "توی" کیلئے مضامین بھی لکھنے شروع کر دئیے۔

اُس زمانہ میں بی۔ اے کا اِمتحان دینے کے لئے ریاست کے طلباء کو لاہور جانا پڑتا تھا مگر ۱۹۱۹ء میں جب لالہ صاحب نے اِس امتحان میں بیٹھنا تھا، اِمتحان کا سنٹر سیال کوٹ میں منتقل ہو چکا تھا کیوں کہ جلیانوالہ باغ کے خونی حادثہ کے بعد اُس وقت لاہور میں مارشل لاء جاری تھا۔

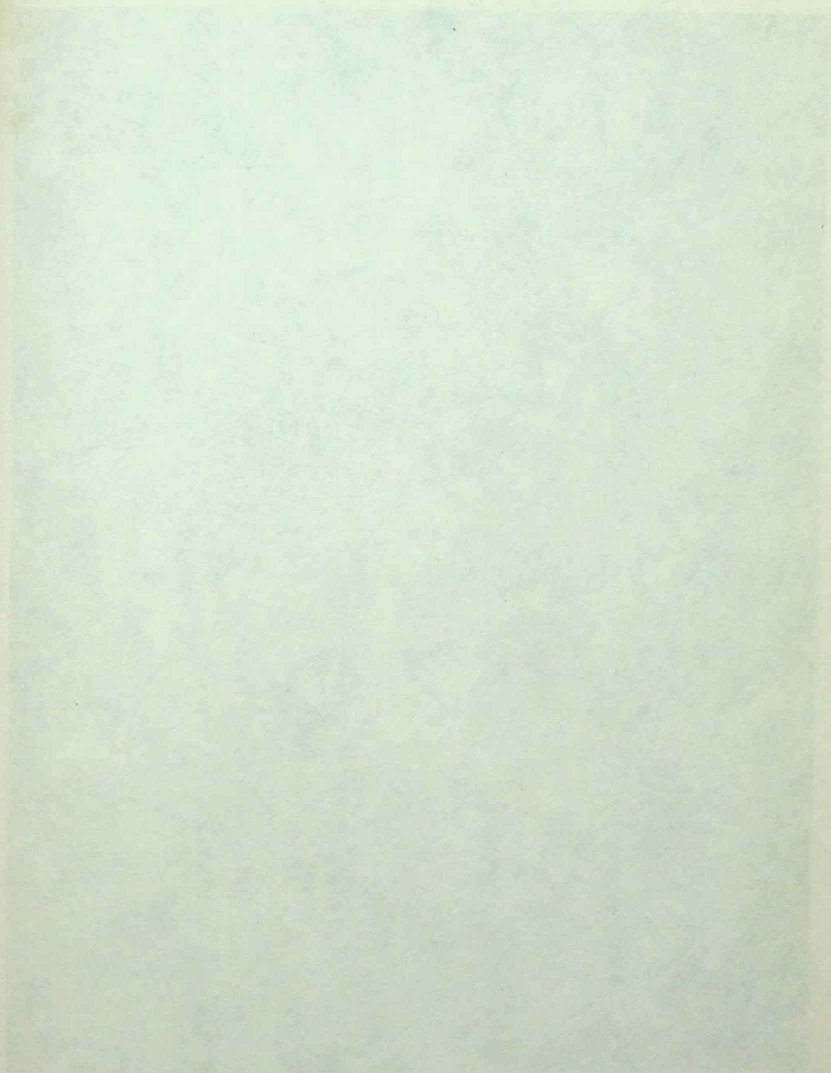
بی۔اے کا اِمتحان پاس کرنے کے بعد ان کے مشفق بھائی لالہ کرم چند صرّاف نے انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی اور

---

[1] روزنامہ "کشمیر ٹائمز"۔ جموں۔ مورخہ ۱۷، نومبر ۱۹۸۵ء
[2] اخبار "سچ" جموں مورخہ ۵، مارچ ۱۹۶۵ء



لالہ ملک راج صرّاف



قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لاء کالج لاہور میں داخلہ کا بندوبست کر دیا۔ اس وقت صراف صاحب کی عمر ۲۵ برس تھی۔ ان ہی دنوں اُن کی سگائی شکر گڑھ (ضلع گورداسپور پنجاب) کے وکیل نند لعل کی دُختر نیک اختر گیان دیوی سے طے پائی۔

لاہور اُس زمانہ میں سیاسی سرگرمیوں کا خاص مرکز تھا۔ پنجاب میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد قومی بیداری کی زبردست لہر پھیل گئی۔ ملک بھر کے بڑے بڑے راہنما امرتسر اور لاہور میں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان میں لوکمانیہ تلک، ڈاکٹر اینی بیسنٹ پنڈت مدن موہن مالویہ، سی۔آر۔داس، بابو بپن چندر پال، بابا کھڑک سنگھ، مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، مولانا آزاد، سردار پٹیل، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، پنڈت جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس شامل تھے۔ لالہ ملک راج صراف اُن کی تقریریں بلاناغہ سُنتے رہے جنھوں نے انہیں بہت متاثر کیا۔ ان مصروفیات کے سبب اُنہوں نے قانون کی کتابیں پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی اور بقول اُن کے لاء کالج کے پہلے سال کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ۲۶ سال کی عُمر میں یونیورسٹی کی تعلیم کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا اور اخبار نویسی میں قدم رکھا۔

پنجاب کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے نے لاہور سے ایک روزانہ اخبار "بندے ماترم" جاری کر رکھا تھا۔ لالہ صاحب نے اپنی خدمات پیش کیں اور انہیں اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر اور رپورٹر مقرّر کیا گیا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

"لالہ لاجپت رائے کے چرنوں میں بیٹھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا۔ صحافت کی الف۔ بے سے میری روشناسی کی ابتداء دراصل وہیں سے شروع ہوئی" [1]

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"مجھے اپنی ریاست اور اہلِ ریاست کی بے چارگی اور کسمپرسی کی بار بار یاد آتی تھی ۔ اگر اکیلے لاہور سے اتنے اخبار نکل سکتے ہیں تو کیا جموں و کشمیر ایسی وسیع ریاست ایک اخبار کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی ۔ یہ خیال متواتر ستانے لگا۔"

چنانچہ لالہ ملک راج صراف لاہور چھوڑ کر واپس جموں آگئے۔ روپیہ پیسہ تو تھا نہیں لیکن اخبار جاری کرنے کی اُمنگ ضرور تھی۔ پہلے تو اُنہوں نے راجہ سر ہری سنگھ کی پرائیویٹ اسٹیٹ میں ۶۵ روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کرلی مگر یہ راس نہ آئی۔

۱۹۲۱ء میں اُنہوں نے حکمران ریاست مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو درخواست دی کہ ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ پیشتر اس کے کہ تین چار سال کی متواتر اور ان تھک کوشش کے بعد کسطرح اُنہوں نے اخبار جاری کرنے کی اجازت حاصل کی اس سلسلے میں مختصراً ریاست کے سیاسی ماحول کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے راعی اور رعایا دو چار تھے۔

۱۸۸۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے گدی نشین ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد برطانوی حکومت نے اُن کو پہلے سے ہی تیار

---

[1] اخبار "سیج" جموں مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۵ء

کردہ منصوبے کے تحت نظم و نسق کے تمام اختیارات سے محروم کردیا تھا اور اُنہیں برائے نام مہاراجہ کا لقب دیکر انتظامِ ریاست ایک کونسل کے سپُرد کردیا وہ بھی برطانوی ریذیڈنٹ کے احکام کے طابع تھی۔ ایک کشمیری شاعر خواجہ امیرالدّین امیر نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی بیچارگی کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے ؎

تختِ ایوان جلالت کی نہ کچھ پُوچھ امیر
راجہ اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ بیٹھی کونسل

چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ایک ربڑ کی مہر بن کر رہ گیا تھا اور اقتدار کا مالک برطانوی ریذیڈنٹ بنا دیا گیا جسکے مشورہ کے بغیر کونسل بھی کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی اور جسکی مہر تصدیق کے بغیر کوئی حکم ناطق نہ سمجھا جاتا تھا۔ ریاست میں اخبار جاری کرنے پر سخت پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ اِس لئے ریاست کے کئی باشندوں نے لاہور اور امرتسر وغیرہ سے اخبار جاری کر رکھے تھے۔ اِن میں مشہور صحافی و تواریخ دان مُنشی محمدالدّین فوق بھی شامل تھے۔ ۱۹۰۷ء میں فوق صاحب نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو درخواست بھیجی کہ اخبار "کشمیری" جو لاہور سے شائع ہو رہا تھا سرینگر سے شائع کرنے کی اِجازت دی جائے۔ اِس پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے جو حُکم صادر کیا وہ اُس زمانہ میں اخبارات کے تیئں اِن کی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔ درخواست نامنظور کرتے ہوئے مہاراجہ نے لکھا،

"دریں اثناء خُفیہ طور پر جج ہائی کورٹ کو لکھا جائے
کہ وہ ریاست میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے

کے متعلق ایک ایسا مسودہ قانون وضع کرے جس میں وہ
تمام پابندیاں عاید کردی جائیں جن سے آزادی تحریر دئے
جانے کیساتھ پیش بندیاں بھی موجود ہوں تاکہ کوئی شخص
اس آزادی کا ناجائزہ استعمال نہ کرسکے۔[1]

چنانچہ ۱۹۱۴ء میں پہلی بار ریاست میں پریس اینڈ پبلی کیشنز
ریگولیشن ۱۹۷۱ء بکرمی جاری کیا گیا جس کے تحت مہاراجہ نے اخبار
کی اجازت دینے کے تمام اختیار اپنے پاس محفوظ رکھے۔

صراف صاحب کی پہلی درخواست نامنظور کرتے ہوئے
آپ کو مُطلع کیا گیا" دربار آپ کی درخواست برائے حصول اجازت
اخبار پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"[2]

لیکن صراف صاحب نے ہمت نہ ہاری اور اخبار کی اجازت
حاصل کرنے کے لئے سازگار فضا تیار کرنے میں مصروف رہے۔
چنانچہ چند ماہ بعد اُنھوں نے دوسری درخواست بھیجدی۔ اس کی
نامنظوری کی اطلاع ان الفاظ میں دی گئی :

مہاراجہ صاحب بہادر نے ارشاد فرمایا
ہے کہ ریاست میں اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں دی
جاسکتی۔"[3]

مُلک راج صاحب کی تیسری درخواست بھی نامنظور ہوئی

---

۱ جموں وکشمیر آرکائیوز۔ فائل ۱۱۶-۶-۱۹۲۱ (اولڈ انگلس ریکارڈ)

۲ چٹھی مورخہ ۱۴، اپریل ۱۹۲۱ء

۳ چٹھی مورخہ ۵، جولائی ۱۹۲۱ء



اظہار حال ملکی خواہش اپنی کا مدعا ہے
رنبیر نام کا یہ جام جہاں نما ہے

ہفتہ وار

رنبیر

تار کا پتہ رنبیر جموں

قیمت فی پرچہ ۱ر

اڈیٹر
ملک راج صراف بی اے

منیجر

نمبر ۱ | جموں منگلوار ۱۱ اساڑھ سمت ۱۹۸۱ مطابق ۲۴ جون سنہ ۱۹۲۴ | جلد ۱

پیغام مبارک

The title-page of the very first issue of the RANBIR dated June 24, 1924

اخبار "رنبیر" کا عکس

ایک بار راقم الحروف نے صراف صاحب سے پوچھا کہ آپ تین بار کورا جواب ملنے سے مایوس کیونکر نہ ہوئے اور جموں سے اخبار جاری کرنے کا ارادہ ہی ترک کیوں نہ کر دیا؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا "تین بار مسلسل نفی میں جواب پاکر حیران اور ششدر رہ گیا مگر مایوس نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے بیرون ریاست کے چند اخبارات میں ریاستی حکام کے اس غیر ہمدردانہ رویّہ کے خلاف آواز بلند کی اور ساتھ ہی ڈوگرہ صدر سبھا کے پلیٹ فارم سے بھی اخبار جاری کرنے کے حق میں آواز بلند کی"۔

دریں اثنا ریاستی انتظامیہ میں بھی سازگار تبدیلی ہو رہی تھی۔ مہاراجہ کے اختیارات بحال ہو چکے تھے اور راجہ سر ہری سنگھ ریاست کے سینئر اور فارن منسٹر بن چکے تھے۔ ایک بیدار مغز مدارسی جس کا نام ڈی۔ این۔ نگرکٹی تھا، کامرس اور انڈسٹریز منسٹر مقرر ہوئے تھے چنانچہ لالہ صاحب نے چوتھی درخواست راجہ سر ہری سنگھ کے نام بھیجی جس پر انھوں نے کامرس منسٹر کی رائے طلب کی جنھوں نے اجازت دیئے جانے کے حق میں سفارش کر دی۔ ۱۸، مارچ ۱۹۲۴ء کو کونسل نے اتفاق رائے سے یہ درخواست منظور کر لی جس پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

۲۴، جون ۱۹۲۴ء ریاست جموں و کشمیر میں اخبار نویسی کی تاریخ کا ایک سنہری دن تھا جب لالہ ملک راج صراف نے ہفتہ وار "رنبیر" جاری کیا۔ پہلے شمارہ میں اخباری مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ رنبیر ریاست میں تعلیمی ترقی، سماجی اصلاح اور بہبودی

بیگار کے طریقہ کی مسدودی دیہاتی قرض داری کی سبکدوشی، ملک کی زرعی، صنعتی، مالی اور تجارتی ترقی کی سعی اور ریاست میں ذرائع آمد و رفت کی بہتری اور صحت عامہ کیلئے سہولیات بہم پہنچانے کے لئے جد و جہد کرتا رہے گا۔

رنبیر نے ریاست بھر میں نامہ نگاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔ اس کے اولین نامہ نگاروں کی فہرست بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ صراف صاحب نے سب کو قلم کے جوہر دکھلانے کے مواقع مہیا کئے تھے۔

سرینگر سے راقم الحروف کے علاوہ پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت کاشی ناتھ ایمہ، پنڈت جیالعل کلم۔ سوپور سے غلام رسول خادم، بارہ مولہ سے سری کنٹھ کول، بھدرواہ سے کوتوال رام لعل، کشتواڑ سے مہتہ نند لعل اور عشرت کشمیری، اُدھم پور سے لالہ پرہلاد۔ بھگت وکیل، میرپور سے چودھری گیان چند سدا برتی، مناور سے رائیزادہ ہنس راج بالی بھمبر سے سید زین العابدین اور کامریڈ محمد شفیع، ریاسی سے لالہ ہیم راج وکیل، پونچھ سے غلام قادر بانڈے اور لالہ روپ لعل ایڈووکیٹ، کوٹلی سے بھگت روپ چند وکیل اور منشی چانن دین، بسوہلی سے حکیم کنج لعل، راجوری سے ماسٹر عبدالعزیز اور مرزا فقیر محمد، رام نگر سے لالہ ہیمراج جنڈیال اور کٹھوعہ سے لالہ نتھو رام وکیل اس اخبار کے نامہ نگاروں میں شامل تھے۔ نامہ نگار کے بارے میں اُن کا اپنا ایک نظریہ تھا اور اس کا اظہار اُنہوں نے اِن الفاظ میں کیا ہے:۔

"اگر اخبار کو جسم کے ساتھ تشبیہہ دی جائے تو اخبار

کے نامہ نگار یا وقائع نگار اُس جسم کی رگیں ہیں۔ دونوں
کا آپسمیں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تاہم دونوں میں ایک
فرق ضرور ہے۔ جہاں اخبار کا ایڈیٹر اپنی ذاتی رائے
کے اظہار میں آزاد ہے یعنی وہ اس رائے کو آزادی کے
ساتھ احاطہ تحریر میں لانے کا مجاز ہے وہاں نامہ نگار عام
طور پر بعض ضوابط کا پابند ہے۔ اُس کا فرض اتنا ہے کہ
وہ خبر یا واقعہ کو اپنی اصلی صورت میں پیش کرے۔ اس
کو اپنی عینک کی رنگت سے اخبار کیلئے قلمبند نہ کرے۔
بے لاگ، باضمیر نامہ نگار وہی کہلاتا ہے جو ایک
غیر جانبدار مبصر کا فرض سرانجام دے۔"[۵]

اخبار "رنبیر" میں خبروں کیعلاوہ خبروں پر تبصرے، کہانیاں
اور تبصرے، اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اِس کے لکھنے والوں
میں لالہ ہنسراج مہاجن، پنڈت پریم ناتھ پردیسی، لالہ ہرکشن لعل حبیب،
سیّد ذوالفقار علی نسیمؔ، پنڈت وِشوا ناتھ کیرنی، لالہ گردھاری لعل آنندؔ،
حکیم سرون ناتھ آفتابؔ، قیس شیروانیؔ، ارجن دیو عرشؔ، غلام حیدر
خان چشتی، پنڈت نند لعل کول طالبؔ، کشن سمیلپوری، مرزا مُبارک
بیگ، لالہ رام کرشن غافلؔ، پنڈت سری نواس شاہؔ، ٹھاکر کاہن سنگھ
بلاوریہ اور سردار مہندر سنگھ وغیرہ شامل رہے۔

۱۹۲۶ء میں پنڈت گنگا ناتھ شرما بی۔ اے "رنبیر" کے
جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں ۱۹۳۴ء تک

---

[۵] اخبار "سپچ" جموں مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۶ء

کام کرتے رہے۔

"رنبیر" چھ سال باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور اس عرصہ میں اس نے ریاست بھر میں ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی کافی مقبولیت حاصل کرلی۔ جہاں "رنبیر" نے کئی نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی اور اصلاح کے بعد اُن کے مضامین شائع کئے، وہاں اس نے ریاست میں اشاعت اُردو کی بھی گرانقدر خدمت انجام دی۔

۱۹۳۰ء میں ماہ مئی کے پہلے ہفتہ میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر جموّں پہونچی اور یہاں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ شہر میں مکمل ہڑتال ہوگئی اور شہر میں جلوس نکلنے شروع ہوگئے۔ مستورات نے بھی جلوس نکالا۔ پریڈ گراونڈ میں سارے جلوس جمع ہوئے اور بعد میں شہر میں گھومنے لگے۔ بدیشی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ لوگوں نے اپنے رنج و غصّہ کا اظہار ایک گدھے کو بدیشی کپڑوں سے سنوار کر اس کے گلے میں نکٹائی لگاکر، سر پر انگریزی ٹوپ لگاکر اور اس کو جلوس کے آگے آگے گھمایا۔ اس موقعہ پر اخبار "رنبیر" نے ۷، مئی ۱۹۳۰ء کو سپیشل ضمیمہ شائع کیا جسمیں تمام واقعات تفصیل سے درج کئے۔ اس اخبار کو پڑھ کر مہاراجہ ہری سنگھ بوکھلا اُٹھے۔ انہوں نے فوری طور پر اخبار "رنبیر" کے اجراء کی اجازت منسوخ کردی۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے حکم میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری پر جموّں میں ہوئے مظاہروں کو "شرمناک" قرار دیتے ہوئے لکھا۔

"اخبار" رنبیر" نے نہ صرف اُن واقعات کو جن سے میری رعایا کا کوئی واسطہ نہیں ہے غیر ضروری طور پر نمایاں طریقے سے شائع کیا ہے، بلکہ جہاں تک میرے اور میری گورنمنٹ کے ارادوں اور پالیسی نیز ان مظاہروں کے بارے میں پولیس کی کارروائی کا تعلق ہے انتہائی طور پر پُر از کینہ اور نہایت گمراہ کُن ہے......، میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ یہ کام میرا، میری گورنمنٹ کا یا میری رعایا کا نہیں ہے کہ برطانوی ہند کے معاملات میں مداخلت کی جائے اور میرا یہ دلی عقیدہ رہا ہے کہ برطانوی ہند کی سرکار کے ساتھ معاہدوں کے رُو سے میری جو ذمہ داریاں ہیں اُنہیں ایک مہذب کے عمل کے طور پر بلاشک پورا کیا جائے۔ اِن میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی ریاست میں برطانوی ہند کی سرکار کے خلاف کسی مظاہرے کو برداشت نہ کروں یا ان کی اجازت نہ دوں اور اس امر سے مجھے بہت تکلیف ہوئی ہے کہ "رنبیر" کے جن اقتباسات کا حوالہ میں نے اُوپر دیا ہے وہ اسی بُنیادی سیاسی اصول کے خلاف ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی اُس وعدے کی بھی نمایاں طور پر خلاف ورزی ہوتی ہے جو لالہ مُلک راج صراف ایڈیٹر و مالک اخبار" رنبیر" نے اُس وقت کیا تھا جب اُن کو سٹیٹ کونسل کے ریزولیوشن ع ۸

مورخہ ۱۸ ، مارچ ۱۹۲۴ء کے رُو سے "رنبیر" جاری
کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ میں حکم دیتا ہوں کہ "رنبیر
کے اجراء کی اجازت فوراً منسوخ کر دی جائے اور اسکی
مزید اشاعت روک دی جائے"۔

اسطرح مہاراجہ ہری سنگھ نے اُس وقت ریاست میں شائع
ہونے والے واحد اخبار کو سیاست کی بلی پر بھینٹ چڑھا دیا۔ چنانچہ
سردار بُدھ سنگھ جی نے "رنبیر" کی اشاعت پر پابندی کو "گُناہِ کبیرہ"
سے تعبیر کرتے ہوئے زبردست پروٹیسٹ کیا اور مہاراجہ ہری سنگھ
کو ایک خط لکھا۔

لالہ مُلک راج صرّاف اور "رنبیر" کو ایک دوسرے سے
الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے زیرِ نظر مضمون میں رنبیر کا ذکر ذرا تفصیل
سے آئے گا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس سوانحی خاکے میں
ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ ناگزیر ہے۔

"رنبیر" بند ہو جانے کے بعد لالہ مُلک راج صرّاف، پنڈت
گنگا ناتھ شرما اور اخبار کے مینجر لالہ شِو رام گُپتا نے مُشترکہ طور پر
ایک ہفتہ وار اخبار لاہور سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام
"امر" رکھا گیا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا اور مُلک راج صرّاف و
پنڈت گنگا ناتھ نے اِس اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اُنہوں نے
لاہور سے اخبار "مشیر" جاری کیا جس کے ایڈیٹر پنڈت گنگا ناتھ
شرما مقرر ہوئے۔ اِس کے جوائنٹ ایڈیٹر کشن سمیلپوری تھے۔
۱۹۳۱ء میں ریاست کے سیاسی حالات نے پلٹا

کھایا۔ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کے زیرِ قیادت ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ راجہ ہری کرشن کول وزیرِ اعظم مقرر ہوئے جن کے مشورہ پر مہاراجہ ہری سنگھ نے "رنبیر" پر عائد کردہ پابندی منسوخ کردی۔ چنانچہ ۱۷ ماہ کے بعد اخبار "رنبیر" دوبارہ جاری ہوا اور اخبار "مشیر" بند کردیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں "رنبیر" کی چھپائی کے بہتر انتظامات کی خاطر ایک برقی پریس لگایا گیا جو جموں میں اپنی قسم کا پہلا چھاپ خانہ تھا۔

صراف صاحب کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ ماہوار رسالہ 'رتن' کا اجرا تھا۔ بچوں کا یہ ماہوار رسالہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس کی زبان اُردو تھی اور اس کے ایڈیٹر شانتی سروپ نشاط تھے۔ کچھ عرصہ بعد پروفیسر کندن لعل اور اوم پرکاش صراف نے اس کی ادارت سنبھالی۔ رتن کا شمار ملک بھر کے بہترین ادبی رسالوں میں ہوتا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا بیان ہے کہ "یہ رسالہ مضامین کے تنوع اور ترتیب کے سلسلے کی وجہ سے ایک اعلےٰ مقام حاصل کرچکا تھا۔ بچوں کی ذہنی سطح کے ادبی مضامین کے علاوہ اس رسالہ میں نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں .... ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ اس رسالے کی اشاعت پچیس ہزار تک پہونچ چکی تھی۔"[۵]

صراف صاحب نے "راج محل پبلشرز" کے نام سے

---

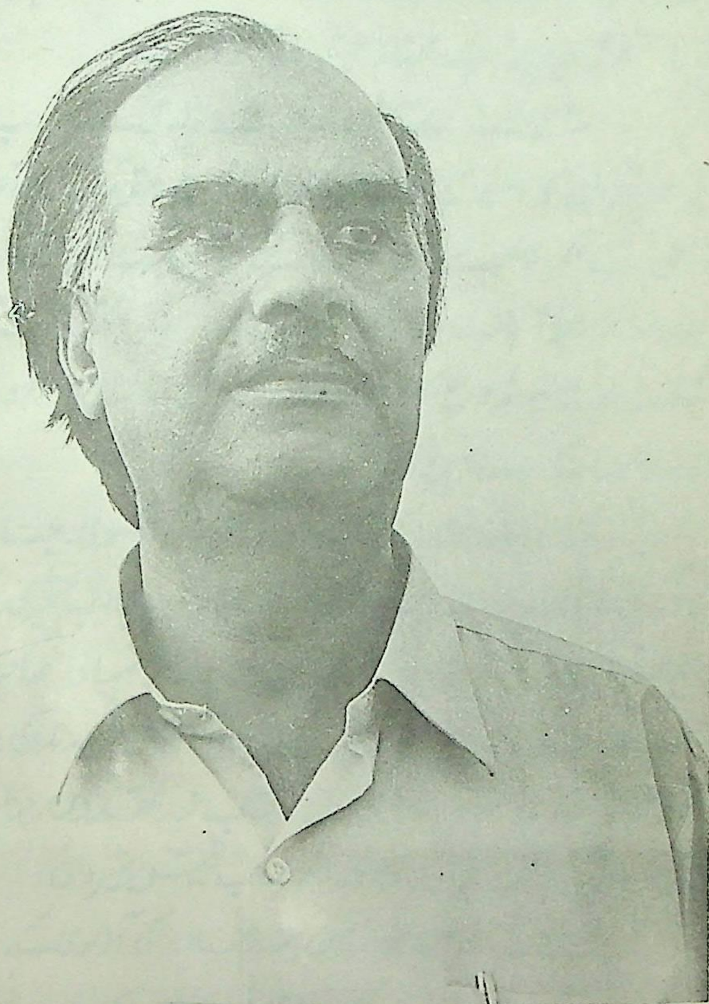
۵ کشمیر میں اُردو۔ حصہ اول۔ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری مطبوعہ کلچرل اکادمی۔ صفحہ ۵۴۴

ایک اشاعتی اِدارہ بھی قائم کر رکھا تھا جس نے اُردو کی اشاعت میں گرانقدر خدمت سرانجام دی۔ ادارہ کی شائع کردہ اُردو کُتب میں جناب نواب مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی کا منظوم ترجمہ بھگوت گیتا "نغمۂ جاوید" ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۴۲ء کے آخری دِنوں میں لالہ جی نے صاحبزادہ محمّد عمر نُور الٰہی کو اِس کے ادبی سیکشن کا انچارج مقرّر کیا۔ وہ "علامہ ڈرامی" کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ آپ نے تین مختلف عنوانات مثلاً "بابِ ادب" "ادبیات" اور "تنقید" سے ایک سِلسلہ مضامین شروع کیا۔ مضامین کے اِس سِلسلہ میں حِصّہ لینے والوں کے چند نام یُوں تھے:۔

خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خان آثر لکھنوی۔ جناب فیض لُدھیانوی۔ پنڈت اقبال کرشن در۔ پروفیسر طالب کشمیری۔ پنڈت پریم ناتھ پردیسی۔ خواجہ عبد السمیع پال۔ جناب اثر صہبائی۔ صاحبزادہ حسن شاہ۔ جناب ساگر چند گورکھا۔ جناب اُبوالشمس توحید ندوی۔ جناب کشن سمیلپوری۔ جناب منوہر لعل دِل۔ جناب عبد القدوس۔ جناب اختر فاروقی۔ جناب حبیب کیفوی اور جناب قیس شیروانی۔

۱۹۴۷ء میں جوں جوں ہندوستان کی آزادی کے دِن نزدیک آ رہے تھے ریاست کی سیاسی فضا میں ایک عجیب قسم کی اُلجھن پیدا ہو گئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور اُس کا پرائم منسٹر رام چند کاک ریاست کو آزاد رکھنے کے حق میں تھے۔ صرّاف صاحب نے اِس تجویز کی مُخالفت کی اور "رنبیر" میں زور دار مُطالبہ کیا شیخ محمّد



دینا ناتھ نادم

عبداللہ کو رہا کر دیا جائے۔ چنانچہ کاک صاحب نے "رنبیر" کو بلیک لسٹ کر کے اسے سرکاری اشتہارات سے محروم کر دیا۔ ماہ مئی ۱۹۴۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے پریذیڈنٹ آچاریہ کرپلانی جموں آئے تو لالہ ملک راج صراف نے ان سے ملاقات کی اس پر کاک صاحب ناراض ہو گئے اور ۲۳، جون ۱۹۴۷ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جموں نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے زیر رول ۳۵ اخبار "رنبیر" کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ دوسرے حکم کے ذریعہ پریم پرنٹنگ پریس پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

مہاتما گاندھی کے دورہ کشمیر اور مہاراجہ سے ملاقات کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ پنڈت رام چندر کاک کی جگہ میجر جنرل جنک سنگھ کو پرائم منسٹر مقرر کیا گیا۔ ۲۸، اگست ۱۹۴۷ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جموں نے "رنبیر" اور پریم پرنٹنگ پریس پر پابندی کے احکام منسوخ کر دئے اور صراف صاحب نے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو "رنبیر" کی اشاعت بحال کر دی۔

تقریباً پچیس سال راعی اور رعایا ریاست کی خدمت کرنے کے بعد لالہ ملک راج صراف نے ۱۹۵۰ء میں اخبار "رنبیر" کو یکلخت ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

حیران کن بات تھی کہ شخصی حکومت کے دوران تمام مشکلات کا مقابلہ تو صراف صاحب ڈٹ کر کرتے رہے مگر شیخ عبداللہ کے عوامی راج کے سامنے آپ نے ہتھیار ڈال دئے۔

صراف صاحب نے اپنی انگریزی زبان میں لکھی سوانح حیات

میں تو صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا گیا کہ :-

"زنبیر" کی آواز کو دبانے کیلئے شیخ محمد عبداللہ کے مشیروں نے قسم قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دئے۔ آخر ۱۸ مئی ۱۹۵۰ء کو میں نے اخبار "زنبیر" ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "زنبیر" کے آخری پرچہ میں یہ اعلان شائع کر دی کہ ایسے حالات سے مجبور ہو کر جن کا ذکر اس وقت کرنے کی ضرورت نہیں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ "زنبیر" ہمیشہ کیلئے بند کر دیا جائے[1]

پاکستان سے شائع ہونے والے روزنامہ "مشرق" میں جناب کیفوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اُنھوں نے اس واقعہ پر مزید روشنی ان الفاظ میں ڈالی :-

"صراف صاحب کو کہا گیا کہ وہ حکومت پر نکتہ چینی نہ کریں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ریاست کا مشہور سیاستدان، جو بعد میں بھارت کا وزیر بنا، پنڈت ڈی پی۔ دھر صراف صاحب کے پاس آیا مگر صراف صاحب نے کہا کہ میں حکومت پر تنقید بند نہیں کر سکتا اور بقول صراف صاحب وہ رات میں نے بڑی بے چینی سے بسر کی اور صبح اخبار بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ پریس نیلام کر دیا اور جھوٹ اور مکر و فریب کے ساتھ مصالحت نہیں کی" [2]

---

[1] "ففٹی ایریس ایز اے جرنلسٹ" ملک راج صراف، ص ۲۳۔۱۳۲

[2] روزنامہ "مشرق" لاہور ــ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۹ء

گو اخبار "رنبیر" بند ہوگیا مگر صراف صاحب نے صحافت کے میدان میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ آپ مُلک کے مشہور اخبارات مثلاً ہندو (مدراس)۔ امرت بازار پتر کا (کلکتہ)۔ سٹیٹسمین (دھلی)۔ ٹربیون وغیرہ کے نامہ نگار رہے۔

سنہ ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند نے لالہ مُلک راج صراف کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازا۔ اِس موقعہ پر اُردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر (جو خود ریاستی باشندہ تھے) نے بمبئی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"صراف ہوکر بھی آپ نے سونے چاندی کی پرواہ نہیں کی اور آپ ہمیشہ اُس کے قائل رہے جو الفاظ میں چمکتا ہے ریاست کے سبھی شاعروں اور قلمکاروں کو "رنبیر" نے ہی متعارف کرایا ہے"۔

اِس کے بعد جموّں میں بھی اخبار نویسوں نے لالہ صاحب کو اعزاز ملنے پر کئی تقاریب مُنعقد کیں۔ ریاستی حکومت نے بھی لالہ صاحب کو خلعت فاخرہ سے نوازا۔

لالہ صاحب نے کالج کے ایّام میں ہی ڈوگرہ ینگ منز ایسوسی ایشن کی بُنیاد رکھی تھی جس کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ بعد میں وہ جموّں وکشمیر کی اوّلین پبلک انجمن ڈوگرہ صدر سبھا سے بحیثیت ممبر اور جنرل سیکریٹری وابستہ رہے۔

صراف صاحب شروع سے ہی ریاست میں آزادی تحریر و تقریر کے حامی رہے۔ ڈوگرہ سبھا کے ایک اجلاس میں آپ نے ریزولیوشن

پیش کیا کہ تقریر پر عائد کردہ پابندی ہٹائی جائے۔ اس ریزولیوشن کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب ملک فضل حسین نے اپنی تصنیف "کشمیر اور ڈوگرہ راج" میں لکھا ہے:

"بدقسمتی سے یہ ریزولیوشن پاس نہ ہو سکا۔ اسکی تحریک اور تائید تو بہت زبردست اور کافی ہوئی مگر مسلمان ممبروں نے (جو چند ایک تھے) اس ریزولیوشن کی مخالفت کی نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے محرک لالہ ملک راج صراف نے یہ ریزولیوشن واپس لے لیا اور اس ناگوار بحث کا خاتمہ کر دیا جو اس ریزولیوشن سے پیدا ہو گئی تھی۔"[ء]

۱۹۳۱ء میں صراف صاحب آل انڈیا مہاجن کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ کانفرنس شکر گڈھ میں منعقد ہوئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جموں نے ایک حکم کے ذریعہ صراف صاحب کو چھ ماہ کے لئے سانبہ میں نظر بند کر دیا۔ انہیں زیر دفعہ ۱۰۸ ضابطہ فوجداری جموں شہر سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اُن پر اس وقت کی ہندو ایجیٹیشن کو بڑھاوا دینے کا الزام لگایا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے سرینگر میں منعقد ناردرن انڈیا ایڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کی صدارت کی جس کا افتتاح ممتاز ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین نے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں ہی آپ آل جموں وکشمیر نیوز پیپرز ایڈیٹرس کانفرنس کے چیرمین بھی رہے جس کا افتتاح امرت بازار پتر کا (کلکتہ) کے ایڈیٹر شری توشار کانتی گھوش نے کیا تھا۔ یہ کانفرنس بھی سرینگر

ء "کشمیر اور ڈوگرہ راج" مصنفہ ملک فضل حسین

میں منعقد ہوئی تھی۔ آپ آل انڈیا ورکنگ جرنلسٹس فیڈریشن کی کشمیر شاخ کے بھی سالہا سال تک پریذیڈنٹ رہے۔ ۱۹۵۶ء میں صراف صاحب نے جن بیرونی ممالک کا دورہ کیا اُن میں فرانس، فن لینڈ، روس، چین، کوریا اور ہانگ کانگ شامل تھے۔ وہ ۱۹۵۶ء میں ہیلی سنکی (فن لینڈ) میں منعقدہ "ورلڈ کانگریس آف جرنلسٹس میں بحیثیت جموں وکشمیر کے نمائندہ شامل ہوئے جسکے بعد انہوں نے بیرونی ممالک کا وسیع دورہ کیا۔ واپسی پر جموں کے اخبار نویسوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹس کے سالانہ اجلاس (۱۹۸۶ء) منعقدہ کٹک میں لالہ ملک راج صراف کی بحیثیت بزرگ ترین اخبار نویس عزت افزائی کی گئی آپکو خلعت فاخرہ پیش کی گئی۔

۱۹۷۹ء میں لالہ صاحب دو ہفتہ کی پاکستان یاترا پر گئے۔ وہاں اِن کے دوستوں اور احباب اور پُرانے ساتھیوں نے نہایت گرمجوشی، محبت اور عقیدت سے آپ کا اِستقبال کیا۔ واپسی پر صراف صاحب نے "میری پاکستان یاترا" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔

صراف صاحب نے کئی اور کتابیں بھی لکھیں۔ ۱۹۴۶ء میں "جموں وکشمیران سائیکلوپیڈیا" کے نام سے ۲۸۵ صفحات پر مشتمل ایک کتاب اردو زبان میں شائع کی جس میں ریاست کی مختصر تاریخ اس کا جغرافیہ، آمدنی اخراجات، نظم ونسق وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں انگریزی زبان میں 'Fifty years as a Journalist'

(پچاس برس بطور صحافی) کے نام سے ۱۷۲ صفحات کی کتاب شائع
کی۔ یہ صراف صاحب کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔
شیر ڈوگر لالہ ہنسراج مہاجن کی زندگی کے حالات پر آپنے
ایک کتاب آل انڈیا مہاجن کانفرنس کی فرمائش پر لکھی۔ اس کا پیش لفظ
لالہ مہرچند مہاجن سابقہ چیف جسٹس ہند نے لکھا۔ بعد میں یہ
کتاب ڈوگری زبان میں بھی شائع کی۔ ۱۹۷۰ء میں لالہ صاحب نے
"THE YEAR Book & Who's Who" نام سے ایک تاریخی کتاب شائع
کرنے کی بنیاد رکھی۔ یہ کتاب چوتھی بار ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ ریاست
جموں وکشمیر کے آئین، نظم ونسق، مجلس قانون ساز، عدلیہ، ریاست کے
بھارت کیساتھ سیاسی تعلقات، اقتصادی حالات وغیرہ کی یہ ایک
مکمل دستاویز ہے۔ اس میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک چیدہ چیدہ
مگر اہم واقعات بھی تاریخ وار درج ہیں۔ "میری پاکستان یاترا" کا دوسرا
ایڈیشن بہ عنوان "انسانیت ابھی زندہ ہے" بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ
کتاب صراف صاحب کا ایک شاہکار سفر نامہ ہے۔

لالہ ملک راج صراف نے جوانی میں قدم رکھتے ہی چار خواب
دیکھے تھے۔ خوش قسمتی سے اُن کی تعبیر بھی اُنہوں نے اپنی زندگی میں
ہی دیکھ لی۔ پہلا خواب تو ریاست سے اخبار جاری کرنے کے متعلق تھا
جو ۱۹۲۴ء میں پورا ہوا۔ دوسرا ریاست میں اپنی یونیورسٹی قائم کرنے
کے متعلق تھا۔ تیسرا ریاست میں اپنا بنک قائم کرنا اور چوتھا مجلس
قانون ساز کا قیام۔ اخبار جاری کرنے کے بعد اُنہوں نے باقی تین
مسئلوں پر اپنے اخبار کے ذریعہ زوردار پراپیگنڈا کیا اور اس طرح

ریاست جموں و کشمیر کو ایک ماڈل سٹیٹ بنانے میں مدد دی۔

صراف صاحب کی زندگی "سادہ رہن سہن اور اونچے خیالات" کے اصول پر مبنی تھی۔ آپ کی خوراک نہایت سادہ مگر مقوی ہوا کرتی تھی۔ صبح سویرے تازہ دودھ کے ساتھ مغز بادام کھانے کے عادی تھے۔ کھانے کیساتھ پانی ہرگز نہ پیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد پانی پینے سے پیٹ کی بیماریاں نہیں ہوتیں۔ موسم کے پھل ضرور استعمال کرتے تھے۔ روزانہ کئی میل پیدل سفر کرتے تھے۔ موسم گرما اکثر سرینگر میں گزارتے تھے۔ اور اتوار کو امیراکدل سے پیدل چشمہ شاہی کا سفر کرتے تھے۔ اس چشمہ کا پانی آپ کو بہت پسند تھا۔ پورے گاندھی بھگت تھے۔ کھادی پہنتے تھے۔ پاجامہ، کُرتا اور اچکن اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ لالہ صاحب کی شخصیت ایک روشن مینار کی طرح تھی۔

پچانوے (۹۵) سال کی عمر میں صراف صاحب کا ۲۱ فروری ۱۹۸۹ء کے دن بمبئی میں انتقال ہوا۔ آپ پانچ بیٹے، ایک بیٹی اور ۱۸ پوتے پوتیاں چھوڑ گئے۔ خدا کے فضل سے آپ کے پانچوں بیٹے اہل قلم ہیں۔

آپ کی وفات پر ہند اور پاکستان کے متعدد اخبارات میں آپ کی تصاویر اور زندگی کے حالات شائع ہوئے۔ کئی اخباروں نے ایڈیٹوریل سپرد قلم کر کے صحافت کے تئیں اِن کی خدمات کو سراہا۔

صراف صاحب اِس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں مگر ریاستی اخبار نویسی کے ایک اہم بانی کار کی حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ

اور پائندہ رہیں گے کیونکہ جس پودے کو اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا وہ اب تناور درخت بن چکا ہے۔ اُنہوں نے اپنی ماں شریمتی جمنا دیوی اور اپنی رفیقۂ حیات شریمتی گیان دیوی کی یاد میں ایک ٹرسٹ قائم کیا جس کا مقصد اخبار نویسی کو بڑھاوا دینا ہے۔ ٹرسٹ نے ابھی تک کئی جرنلسٹوں کو اِنعامات سے نوازا ہے۔ اُن کے لواحقین نے صراف صاحب اور اُن کے بڑے بھائی لالہ کرم چند صراف کی یاد میں ایک خیراتی ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ اِس ٹرسٹ کا مقصد غرباء کی اِمداد، تعلیمی وظائف بہم پہنچانا اور رفاہِ عام کے کاموں میں مالی اِمداد دینا ہے۔



دینا ناتھ نادِم

زٔرِ مِتی کھاہ ہُٹکھی متی کھل آسن
بے کار گرن منٛز ہل آسن
بے تاب اگر وُزمل آسن
پھل وُڈ وُڈ انبارن روزِیا؟

چمنن منٛز ٹُوٹرین سیٖچ لٔجمٕژ
پوشہِ کنہٕ باغنس سٕتی پھوٚلٕمٕژ
داو ہرزٕ نٕہ تیٖلہ آسہٕ ہی گٔجمٕژ
تیٖلہ یاوُن گُلزارن روزِیا؟

(جلے کھیت سوکھے کھلیان ہوں گے — بے کار گھروں میں ہل ہوں گے
اگر بجلیاں بے چین ہوں گی — تو کیا فصل جمع کر کے انباروں میں رہے گی؟
پھلواڑیوں میں غنچے بے قرار ہیں — پھولوں کی جگہ باغ میں بچھو بُوٹی کھلی ہے
خزاں کی ہوا سے جب جوبن ختم ہو گیا ہو — تو کیا گلستانوں میں جوبن باقی رہے گا؟)

ٹ ایک قسم کی جھاڑی جس کے چھوٹے [illegible] آبلے سے نمودار ہوتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخری ایام مسلسل برفباری اور اسی دوران نیشنل کلچرل فرنٹ کی طرف سے نمائش گاہ کے ایک بڑے سٹال میں (جس کے ساتھ ہی اسی فرنٹ کا دفتر تھا) ایک اعلٰی پیمانے کی بزم شعر سجی تھی۔ اچانک ایک قدآور شخص سر پر پگڑی باندھے اور پٹو کی (شارٹ) اچکن پر خود رنگ برف سے بھیگی لوئی اوڑھے مجلس میں داخل ہوا اور پچھلی صف میں ایک طرف جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ مجلس میں اس وقت کے اعلٰی پائے کے کشمیری اور اردو شعراء اور ادیب موجود تھے۔ کئی لوگ اس گمنام شخص کی طرف دیکھنے لگے۔ اب تک کئی شعراء نے اپنا اپنا کلام سنا کر داد حاصل کی تھی اور اسی دوران کسی نے صدر محفل سے کہا: "نادم صاحب، نادم صاحب"۔ صدر محفل نے اُس کی طرف دیکھا اور حامی بھر لی، اور نو وارد نے لوئی ایک طرف رکھ کر گرجنا شروع کیا، اور "گِزاو" (شکوہ) نام کی نظم پیش کی جس کے دو بند اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ ایک ایسا ماحول پیدا ہوا جس میں میر تقی میر نے یہ اشعار پیش کئے تھے ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

نادم صاحب کی یہ نظم سنانے سے یوں ہوا کہ جیسے ایک زبردست گرج سے ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ نظم ختم ہو گئی اور نادم صاحب ندامت سے اپنی جگہ واپس جا بیٹھے۔ داد کیا ملی جیسے ہنگامہ بپا ہوا۔ پھر کون ہمت کرتا اس کے بعد کلام سنانے کی۔ مجھے اگر صحیح یاد ہے اسی وقت مہجور صاحب نے آہستہ سے اپنے ساتھ بیٹھے کسی شاعر سے کہا کہ "آئندہ کا کشمیری شاعر یہی ہے"۔

جس وقت نیشنل کلچرل فرنٹ قائم ہوا، چند بنیادی ممبروں (میرے سمیت) نے نادم صاحب کو اس تنظیم میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی تھی مگر چند خود

ساتھ اور حاسد لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ نادمؔ صاحب کو شامل کرنے سے انکا اپنا مقام و وقار باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ جب مذکورہ بالا مشاعرے کا وقت آیا ہم نے نادمؔ صاحب کا نام بھی تجویز کیا تھا مگر فہرست سے صرف یہی نام کاٹا گیا۔ میں اُن دنوں فرنٹ کے لٹریری شعبے میں کام کرتا تھا اور پی۔ این کاچرو مصوری کے شعبے میں۔ چنانچہ اس مصور کو شعراء کے گھر جاکر مشاعرے میں شمولیت کی دعوت دینے کے لئے کہا گیا۔ میں نے اُس کے ساتھ بات کی اور ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ نادمؔ صاحب کو ضرور مشاعرے میں لانا ہے پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ کاچرو صاحب برفباری کے دوران تانگے پر شعراء کو مدعو کرنے کے لئے گئے۔ دوسرے روز دفتر پہنچے اور کہا کہ نادمؔ صاحب آئیں گے۔ جب نادمؔ آئے اور کلام سنایا تو کون پھر مخالفت کرنے کی جسارت کرتا۔؟ ہندی زبان کے مشہور نقاد شیوران سنگھ چوہان (جو شروع نومبر ۱۹۴۷ء میں ملک کے دوسرے ادیبوں کے وفد کے ساتھ یہاں آیا تھا اور کشمیر کی ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے ۱۹۵۱ء تک یہاں ہی رہا) نے جب اس نظم کا ترجمہ سُنا تو اُس نے اس بزم شعر میں نادمؔ صاحب کی دل کھول کر تعریفیں کیں اور یوں نادمؔ تنظیم کا ایک اہم رُکن بن گئے۔

نادمؔ صاحب نے اس سے پہلے بھی دو مقامات پر اپنی دو کشمیری نظمیں پڑھی تھیں اور داد تحسین حاصل کی تھی۔ ایک نظم میں انہوں نے لوگوں کا "گلہ" پیش کیا تھا ؎

ژٲنے بایہ پنہٕ نے کیاہ وَنے   ژٲنے گژراہ کرنہ واریاہ ......

(اے برادر! اپنا کیا کہوں، تجھ سے بہت سے گلے کرنے ہیں ....)

یہ نظم انہوں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں جبہ کدل چوک میں لوگوں کے ایک بھاری

ہجوم میں سنائی تھی اور اس سے قبل ایک نظم ۱۹۴۶ء میں عارف صاحب کی جانب
سے نشاط باغ میں آراستہ ایک بزم شعر میں۔ مگر جو تاثر کلچرل فرنٹ کی مجلس
میں اُبھرا وہ بہت گہرا تھا اور نادم پلک جھپکتے ہی پاتال سے آکاش تک جا پہنچے
جہاں سے وہ کبھی پیچھے نہ مڑے۔ کشمیری شاعری شروع کرنے سے پہلے نادم اردو
میں شعر کہتے تھے اور ان کی نظمیں مقامی اخباروں کے ہفتہ وار ایڈیشنوں خاصکر
"دیش" کے پہلے صفحے پر چھپتی تھیں۔ ان شعری تخلیقات کا رنگ اور لوز لاویز ہوتا
ان کی تازہ تشبیہ کاری، تشبیہات، استعارات اور پیکر تراشی بیش بہا ہوتی۔
والدہ کے اثر، انگریزی شاعری اور اردو میں چکبست، اقبال اور غالب وغیرہ جیسے
شعراء اور ٹیگور کے مطالعے نے انہیں جھنجھوڑا تھا۔ اور ایک درویش صفت عاقل
درویش کی صحبت نے انہیں مکمل شاعر بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ عاقل اور نادم آپس میں
اشعار میں ہی بات چیت کرتے تھے جو فی البدیہہ ہوتے اور اس گفتگو کا ایک
اچھا خاصا حصہ عاقل کے ایک شاگرد ہری کرشن فالی کے پاس محفوظ ہے۔ فالی
اب مستقل طور جموں میں قیام پذیر ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں نادم صاحب کو احساس ہوا
کہ مادری زبان ہی اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی زبان میں
مستقل طور پر اپنے خیالات کو بیان کرنا شروع کیا۔

نادم صاحب ایک غریب مگر شریف گھر کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد
جو ایک چھوٹے سرکاری ملازم تھے، نادم کے لڑکپن میں ہی اس دنیا سے چلے گئے
تھے جب نادم کی عمر سولہ سال تھی۔ نادم کی والدہ پر نادم کے علاوہ اُس کی بڑی

ف نادم صاحب کہتے تھے کہ یہ شاعر ہر سال کشمیر آتا تھا۔ یہاں نادم کے علاوہ اس کے اور بھی
کئی شاگرد تھے جن میں آنجہانی ڈی پی در متخلص رونق بھی شامل تھے۔ عاقل درویش فی البدیہہ
شعر کہتا تھا اور اس کے شاگرد یہ اشعار قلمبند کرتے تھے۔ نادم صاحب نے مجھے بھی اس کے
کئی بہت ہی حسین اشعار سنائے تھے۔

بہن کو پالنے کا بھاری بوجھ پڑ گیا۔ چنانچہ فرقہ کات کر اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو پالا پوسا۔ جہاندیدہ، دانشمند اور شاعرانہ مزاج رکھنے والی ماں نے ناؔدم کو سخت حساس بنا دیا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی ناؔدم نے پرائیویٹ ٹیوشن کرانے شروع کئے تا کہ کسی صاحب ثروت رشتہ دار کا مرہون منت نہ ہونا پڑے۔ ناؔدم نے مجھ سے خود کہا ہے کہ کالج میں داخلہ لینے پر اس کے پاس اپنی کوئی درسی کتاب نہیں تھی۔ وہ کالج اور لال منڈی کی لائبریریوں سے استفادہ کرتا اور تعلیم کے میدان میں آگے قدم بڑھاتا تھا۔ لیکن کبھی بیماری کی وجہ سے اور کبھی گذارہ نہ ہونے کی وجہ سے اخراجات پورے نہ ہوتے تو تعلیم میں رکاوٹ پیش آتی تھی۔ چنانچہ حالات میں سدھار لانے کے لئے پے درپے پرائیویٹ ٹیوشن کرتے اور پھر نئے سر سے تعلیم جاری رکھتے۔ جوں توں کر کے بی۔اے پاس کر کے کافی مدت تک ملازمت تلاش کی اور ایک مدت کے بعد ہندو ہائی اسکول میں ٹیچر ہوا۔ بڑھاپے میں بی۔ایڈ کیا اور آہستہ آہستہ اپنی اُستادانہ قابلیت سے ہندو ایجوکیشنل اداروں کی اعلیٰ پایہ کی کمیٹی کے ممبر اور رُوح رواں بنے رہے۔[1]

ناؔدم صاحب کی شخصیت اور کردار تعمیر کرنے میں اُن کی ماں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ بچپن میں انہیں بادشاہوں کے قصے اور ذرا بڑا ہو کر للہ عارفہ کے واکھ اور شیخ العالمؒ کے شلوک اور پرمانند کے اشعار سنایا کرتی تھی۔ یہ ان پڑھ مگر دانشمند ماں انہیں کبھی کبھی اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار بھی گوش گذار کرتی تھی۔ اور دنیا اور دنیاداری سمجھانے کے لئے عاملوں اور درویشوں کا کہا جاننے اور

---

[1] ناؔدم صاحب اساتذہ کی انجمن کے بھی روح رواں تھے۔ ریاستی قانون ساز کونسل کے بھی وہ ممبر تھے، صادق صاحب کے دورِ اقتدار میں وہ ڈائریکٹر ایڈلٹ ایجوکیشن کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

سمجھنے کا درس دیتی تھی۔ دراصل ماں ہی نادم صاحب کی اصل رہنما بنی۔ انہوں نے وسیع مطالعہ کے پہلو بہ پہلو کالج جاتے ہی شعر گوئی بھی شروع کی۔ کبھی انگریزی میں، کبھی ہندی میں اور اردو میں اور آخر پر صرف اردو میں ہی کیونکہ اس وقت اردو کا ہی زیادہ چلن تھا۔ سچ پوچھئے تو نادم صاحب کے لئے گردو پیش کا سماج یونیورسٹی کا نعم البدل ثابت ہوا اور ماں اُن کی استاد۔ ان کی ذہنی بالیدگی دیکھ کر آسودہ گھرانوں کے اُن کے کچھ ہم جماعتی، جو حبہ کدل کے آس پاس رہتے تھے، اُن کے بالکل قریب آ گئے اور ان کے ہم خیال اور عظیم شہید بھگت سنگھ کے پیروکار بن گئے۔ ان میں سے دو تین آدمیوں کے ساتھ بہت عرصہ پہلے میری ملاقات نادم صاحب کی ہی وساطت سے ہوئی تھی جن میں سے دو ایک اب وفات پا چکے ہیں۔

نادم صاحب کے ساتھ میری ملاقات ۱۹۴۵ء میں اُردو شاعر مہندر رینہ کے ذریعہ پلیڈیم چوک (آج کے لال چوک) میں ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں حلقہ "اربابِ ذوق"۔ جو پہلے "پروگریسیو رائٹرس لیگ" اور پھر "پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن" کے نام سے موسوم تھا، کا سیکریٹری تھا۔ میں نے ان کو اس تنظیم کی ہفتہ وار مجالس میں شمولیت کی درخواست کی مگر انہوں نے کہا کہ وہ تلاش روزگار میں سرگرداں ہیں، اس لیے بعد میں شمولیت کریں گے۔ میں پھر بھی اُن کے گھر جاتا رہا مگر وہ شاذ و نادر ہی ملا کرتے۔ وہ بے شک سخت مصروف رہتے۔ شادی تو پہلے ہی ہو چکی تھی اور ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ مستقل روزگار کی تلاش تو جاری تھی ہی، اس پر ٹیوشن الگ! شاعری تو کر لیتے مگر مجلسوں میں شمولیت کی فرصت نہ تھی ۔۔ اور ۱۹۴۸ء میں انہیں مرحوم غلام محمد صادق، شودان سنگھ چوہان، ڈاکٹر این ایل رینہ (جو بائیں بازو کی جماعت کے لیڈر) اور پھر کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ طبعیات کے سربراہ

تھے) مرزا غلام حسن بیگ عارف اور اس خاکسار نے کشمیری شاعری کی طرف راغب کیا۔ ڈاکٹر رینہ نادم کو فن اور ادب پر نئی نئی کتابیں دیتے اور لگ بھگ ہر روز ان کے گھر واقع حبہ کدل ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ میں بھی ان کے گھر جاتا اور پرنٹ کی میٹنگوں میں شمولیت کے لئے کھینچ کر لے جایا کرتا تھا۔ کھینچ کر اس لئے کہ بیگم نادم ان دنوں نادم صاحب کا جلسوں میں شامل ہونا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ عموماً تیسری منزل کے دالان سے ہی مجھے دیکھ کر کہہ دیتیں کہ "وہ کہیں چلے گئے ہیں"۔ ان کا خیال تھا کہ میں انہیں کسی اور طرف متوجہ کرتا ہوں۔ مگر جب کچھ مدت کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ میں نادم صاحب کو گمراہ کرنے والا نہیں بلکہ ان کا ہمدرد ہوں تو انہوں نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ مجھے Avoid کرنے کے لئے نادم صاحب کے گھر میں موجود نہ ہونے کے بہانے تلاش کرتی تھیں۔ کشمیری شاعری کی طرف آنے میں نادم صاحب پر میرا کتنا اثر ہوا اس کا اظہار نادم نے اپنی کتاب "شہل کُل" کی اس کاپی پر جو انہوں نے مجھے تحفتاً بھیجی، اس طرح سے کیا ہے:

"پنہ نس ٹاٹھس بائے سندِ خاطرِ ییمی بہ کاشر شاعر بنووس"

(اپنے پیارے بھائی کے لئے جس نے مجھے کشمیری شاعر بنایا)

نادم صاحب کا کشمیری شاعری کی طرف آنا اس شاعری کے لئے فالِ نیک تھا۔ نئی شاعری کی بنیاد پڑی اور ایک سیلاب سا آگیا جو اپنے ساتھ روایتوں کے مضبوط اور سنگلاخ قلعے بہا کر لے گیا۔ نادم نے ایک نئے رجحان کی بنیاد ڈالی، ایک نئے ڈکشن کو وجود بخشا، نئے اور پہلودار موضوعات کو برتا، نئی ہیئتیں وجود میں لائیں، آزاد نظم، بلینک ورس، سانیٹ، اوپیرا اور داخلی کیفیات کے اظہار کے لئے "ہارِ ثات" اور "زِتِہ" (چنگاریاں) نام کی مختصر سے مختصر اصنافِ شعر اور

جاپانی 'ہائیکو' کے طرز پر مشرقی اشعار کو وجود بخشا۔

ناؔدم صاحب کے ڈکشن اور طرزِ اظہار کی اب بھی بیشتر شعراء تقلید کرتے ہیں اور اگر ہم ۱۹۴۷ء کے بعد کی کشمیری شاعری کے زمانے کو 'ناؔدم یگ' کا نام دیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کچھ موضوعات میں آفاقیت ہے مثلاً نیکی اور بدی' مسیح اور یہوداؔ' 'ظلم اور انصاف' 'غریبی اور امیری' 'بہار اور خزاں'، 'جنگ اور امن' وغیرہ وغیرہ جن کو برتنے کے لئے ایک شاعر میں سماجی شعور اور سماج کی مجموعی حسیت کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ شاعر ذاتی تجربات سے مالا مال ہونا چاہیئے۔ اس کا اظہار گہرا اور گھنا ہونا چاہیئے۔ ناؔدم میں جو سماجی شعور ابتداء سے ہی پیدا ہوا تھا اور جن ذاتی تجربات میں سے وہ گذرے تھے اُن کی وجہ سے اُنکی شاعری ہمہ گیر اور پہلو دار بنی۔ وہ محض اُن کی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ وہ سماج کی نفسیات کا بھی احاطہ کرتی۔ اُن آفاقی موضوعات میں سے جو موضوعات انہوں نے برتے وہ آج بھی تازہ دکھائی دیتے ہیں اور آئندہ بھی سدا بہار رہیں گے۔

ناؔدم صاحب کی زندگی اور شخصیت کے متعلق اس مختصر مضمون میں اُنکی شاعری کی بھرپور وضاحت کی گنجائش نہیں اور نہ ہی اُن کی تخلیقات میں سے کہیں کہیں ایک دو اشعار نکال کر مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اُن کی ہر ایک شعری تخلیق بجائے خود ایک اکائی ہے اور اس میں سے کوئی ایک شعر نکالنا ممکن نہیں۔ وہ ناہموار محسوس ہوگا کیوں کہ ساری تخلیق میں جو ایک خیال اور جو پیکر تراشی یا علامت وہ پیش کرتے ہیں وہ مجروح ہوگی۔ ناؔدم کا ایک ہی شعری مجموعہ "شہل کُل" (سایہ دار درخت) نام سے چھپا ہے لیکن بحیثیت شاعر وہ کن ارتقائی منزلوں سے گذرے ہیں' یہ مجموعہ اس بارے میں ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔ بہرحال میں پھر بھی چند ایک مثالیں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

"سونتھ تہ ہرُد" (بہار اور خزاں) نام کی ایک نظم میں ناظم نے کہا ہے ؎

گاہ لونگ گتہٕ عیشن مُتو کرنے
شبنم لوگ باغس پھوٗلی برنے

منےٚ چھُ باسان شاید اوبرس تل وُزملہ لج مس مژراونے

یمبرزلہ نے سرنوٗمرآو نتھ
داوِن ژُھن شبنم چھکرآوِتھ

مالنو شیٚچھ لوزِتھ مہرینٛز زن وآرِو گرِ لج اوٚش تراونے

(اُجالا اندھیروں سے لپٹنے لگا
شبنم باغ کی جھولی بھرنے لگا

مجھے لگتا ہے شاید بادل کے نیچے بجلی بال کھولنے لگی

نرگسوں کے سر جھکا کر
ہوا نے شبنم کو بکھیر دیا

میکے کا پیغام سن کر جیسے دُلہن سسرال میں آنسو بہانے لگی)

یا

یان ژاوُرِ گیہ اُسو اُسی نیل
تس نہ خبر کمو کوتاہ ووٚد

(آبشار ہنستے ہنستے ہوش کھو بیٹھا
اُسے نہیں معلوم کہ کون کتنا رویا)

یا

سانیٹ "زوٗن کھژ ژوٹ ہشی" (چاند نکلا روٹی جیسا)
جمالیات اور پیکر تراشی کا اس سے خوبصورت اظہار شاید ہی کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔

"مےٚ چھیم اَش پکھچ" (مجھے آشا ہے کل کی) نظم کا ایک آدھا ہی بند پیش ہے۔ یہ ساری نظم ڈرامائی انداز میں لکھی گئی ہے جو امن کا ایک گہرا تاثر پیدا کرتی ہے۔ ایک جواں خاتون دردِ زہ میں خود کلامی کرتی ہے ؎

کرٛزل لاگنہٕ مے گرٛتھن اُچھ کرٛ آلی
وٕسِم وٕنہٕ وٕتہٕ بیہ ٹیٛنڈوٕ گرٛتھن منٛز وٕنہٕ زالی
تہٕ ژٕہہٕ وٕہری دشہ ہار ییہ سون سالی ــــ پٕگاہ شوٗلہِ دنیا!

کنن گرٛتھہ منٛز چان شیان ژلیم وٕہی تہٕ وایہ
وٕچھِس تَل منٛز ژٕہ ژٕہ کریم آیہ گرٛا بیہ
لٔبن لوسہٕ کُھٹھی سیٔنہ گٕھسِم مٔژٕہ مایہ ــــ پٕگاہ شوٗلہِ دُنیا!

شُہ برٕزر نہٕ تَل کِن تھوتھ لوز لوٚت لوٚت
بہ تھزٕ کار تھاوِ تہ شُہ بیٛیہ نیٛبر لوٚت پوٚت
تہٕ وٕنہٕ وُن ہمِس پیوٚتر ماٗلِس بہ سوٚت سوٚت ــــ پٕگاہ شوٗلہِ دنیا!

دیان جنگ چھُ وٕنہٕ تھٕ وُن
پٕگاہ گوٚژھ نہٕ سیٛدُن
پٕگاہ شوٗلہِ دُنیا ــــ پٕگاہ گوٚژھ نہٕ سیٛدُن

(کاجل لگائے بنا ہی میری آنکھیں سُرمگیں ہو جائیں گی
دودھ اترے گا اور پستانوں کے سرے سرخ ہو جائیں گے
اور دس سال کے بعد "دشہ ہار" ہمارے ہاں دعوت پر آئے گا
ــــ کل دنیا چمک اُٹھے گی

کانوں میں چال میاں (بچوں کی آواز) گونجے گی ہائے آہ و فغاں دور ہوگا
چھاتی میں چوسنے کی تحریک (بچوں کے دودھ پینے کا عمل) عمل پائے گی
زچہ خانہ کی دیواروں پر ملمع چڑھے گا ــــ کل دنیا چمک اُٹھے گی
دروازے کی شگاف میں سے کان رکھ کر آہستہ آہستہ سُنے گا
اور پھر گردن اونچی رکھ کر واپس چلا جائے گا۔

اور میں بیٹے کے باپ کو مدہم آواز میں گانا شروع کروں گی
۔ کل دنیا چمک اُٹھے گی

کہتے ہیں جنگ ہونے کو ہے
کل ہی کو نہ ہو
کل دنیا چمک اٹھے گی ۔ کل نہ ہو !)

"بوّمبُر یمبرزل" (بھنورا اور نرگس) اوپیرا میں بھی خزاں اور بہار کی جنگ ہے ۔ چونکہ ناؔدم زندگی کے شدید جاڑے اور گرمی کے تھپیڑے برداشت کر کے آگ سے نکلا کندن بنے ۔ اور اس کے اندر زندگی کی محبت گہری ہوتی جاتی ہے جس کا اظہار اُن کے ہر شعر میں ملتا ہے ۔ چنانچہ اس اوپیرا میں بھی یہی بات ملتی ہے ۔ سماجی بے راہروی انہیں اپنے راستے سے ہٹاتی نہیں ۔ ذہنی عیاشی کرنے والا اور مانگے تانگے سے اُدھار لائے ہوئے تنقیدی اصول برتنے والا نقاد زندگی اور اس کی محبت اور حُسن کیا جانے ؟ اُسے تو اُلّوؤں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے اور وہی اس کو آگہی بخشتے ہیں مگر ناؔدم کی محبت تمام دنیا کی محبت بنتی ہے اور ایک حسین زندگی کا احساس پیدا کرتی ہے ۔ ہمارے نقاد کو اگر تاریخی اور سماجی شعور ہوتا تو وہ یہ نہ کہتا کہ " ناؔدم کی اکثر شاعری جو نظریاتی ہے حقیقت میں شاعری نہیں ہے " ۔ کیا "جدید" شاعری انسانی زندگی اور سماجی سائیکی (Psyche) کے ساتھ کسی طرح کا میل نہیں کھاتی ؟ ذرا سوچئے کہ یہ نقاد ترقی پسند ادب کیخلاف کیوں ہے ؟ اور آج کی عصری آگہی اور حسیت تلاش کرنے کے لئے کیوں نُندہ ریشی ، لل دید ، میر تقی میر اور کشمیری صوفی شاعروں کے دامن تلے آجاتا ہے ؟ ان شاعروں کا کیا اپنا اپنا نظریۂ حیات نہیں ؟ ان کی شاعری نظریاتی نہیں ؟ اقبال اور پریم چند پہ کیوں پھر نظریاتی شاعری اور ادب کا الزام ہے ؟ مانا کہ شاعر کو چاہیئے کہ اپنے اندرونی

محسوسات اور ذاتی تجربات پیش کرے لیکن قاری کے تجربات کے ساتھ میل کھا سکیں
پھر ان کی وقعت کیا ہے؟ وہ تو پھر معدی بخارات ہیں۔ یہ نقاد کہتا ہے کہ شاعر
کے لاشعور میں سے جو ابھرتا ہے وہی شاعری ہے۔ ٹھیک ہے لیکن کیا شاعر اسے
شعوری طور ہیئت نہیں بخشتا اور آراستہ و پیراستہ کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں
کرتا تو کیا پھر سعادت حسن منٹو کی کہانی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے کردار بشن سنگھ
(شاید یہی اس کا نام ہے) کے لاشعوری کلمات کو شاعری کہیں؟ وہ بھی تو اپنے
اوپر گذرے ہوئے واقعات کا لاشعوری طور پر اظہار کرتا ہے۔ مانگے ہوئے
(مستعار) اصول کی بات تو الگ ہے لیکن جب خود نقاد اپنی شعری، افسانوی یا
ڈرامائی تخلیق پیش کرتا ہے تو پھر کیوں "جدید" تنقیدی اصول پس پشت ڈال دئے
جاتے ہیں؟ یا پھر ریلزم کا سہارا ڈھونڈ لیا جاتا ہے؟

نادم صاحب بھی اسی طرح ارتقائی منزلوں سے گذرے جس طرح ایک
عظیم شاعر یہ منزلیں طے کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں جب آہستہ آہستہ ٹھہراؤ
آنا شروع ہوا تو انہوں نے "نابد تہٕ ٹیٹھہ وین" جیسی نظمیں، سانیٹ، حارثات
اور "زنتہ" وغیرہ لکھیں جن میں گہرائی بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی۔ یہ ان کی ذاتی زندگی
کے نقیب ہیں جو قارئین کے بھی تجربات بنتے ہیں۔ یہ بقول جدید نقاد فریب شکستگی
اور (زندگی کی) بے معنویت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ سماجی سائیکی (Psyche) کے
نقیب ہیں۔ ایک مثال پیش ہے ؎

وُچھتھ دِگہ تل لۆج بِرٛزلی لیتچاہ اکھ — بتھ چھُلی چھُلی کھُشر ڈلہ وۆزلی بائے
وُبرِن وۭئلنسن ہندی منہ گھُتی متھ — پاپ تہٕ پِنہ تس چھلنے آیے
اۆر آو کُس تام کھۄشتاہ گۄڈ انس — کترہ بن کینژن لۄگ بییہ آیے
دۄہ یہ دۄہی سز لوٚنگ لۄگ منز کوچس — وۄزرتھ پیٹھ ٹھیکتھ یدی ژایے

(بارش کے ٹپکاؤ کے نیچے ایک بڑا برتن لگا ہے۔ چہرہ دھو دھو کر جیسے
ڈل جھیل سے "ڈوبی بائے" نکلی۔
تمام عمر جو پاپ اور ثواب اُس کے پلے تھے وہ سب دُھل گئے۔
ادھر سے کوئی آیا اور اُسے ٹھوکر ماری۔ چند ٹھیکریوں کو پھر بڑھاوا ملا
دو دن بعد کوچے میں سہر لونگ (ایک کھیل) شروع ہوا۔ دوزخ سے جنت میں قدم
پڑے!

ہم نے اوپر لاشعور کی بات کی ہے۔ نادم صاحب کے ہاں بھی لاشعور کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے تین خوابوں پر مبنی تین نثری نظمیں بعنوان "از بُڈ دوہ" (آج بڑے دن پر) تخلیق کی ہیں۔ (دیکھئے نظم نمبر ۲۔ شیراز (کشمیری) ۸۵ء) ان نظموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اپنے اندرون کے اظہار اور ذاتی تجربے کی یہ نہایت حسین مثالیں ہیں لیکن ان کا ذاتی تجربہ محض اُنہی کا تجربہ نہیں رہتا۔
نادم صاحب کی نظم "انتظار" میں کسی سربستہ راز کی گنگناہٹ (Mystic, overtone) سنائی دیتی ہے۔ یہ خود کلامی کی ایک بہترین مثال ہے جہاں شعری حسن اپنے عروج پر ہے اور کوئی اُلٹا احساس وجود پاتا ہے لیکن پھر بھی زندگی کی جستجو، محبت اور تعلق سے شاعر اپنا دامن چھڑا نہیں پاتا ؎

یارِ دِ زن گام پران	بہٕ کیاہ کرٕ؟
لوِلس ماکھسہ ہان	بہٕ کیاہ کرٕ؟
رُمہٕ رُمہٕ گام گمہٕ وُسران	بہٕ کیاہ کرٕ
(جیسے میری رُوح چھلنی ہوگئی	میں کیا کروں؟
محبت پر پردہ تو نہیں چڑھے گا	میں کیا کروں؟
میرا روم روم پسینہ پسینہ ہوگیا	میں کیا کروں؟)

رنہ دھوبن ۔ ایک آبی پرندے کو بھی کہتے ہیں

نادمؔ صاحب نے کشمیری زبان میں شاعری کا نیا گرامر بھی پیش کیا ہے جو اُردو اور فارسی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ یہ صوتیات پر مبنی ہے اور آواز ماحول کو اُبھارنے کے لیے رواں دواں نظر آتی ہے۔ نظم "نمہ وونہ" (اُس وِن) میں سے دو لائنیں ملاحظہ کریں :-

ٹھنز ٹھنز ٹھنز گرُ چھے وزان
سنو سنو سنو رکھ چھ گرزان

(ٹن ٹن ٹن ٹن گھڑی بجتی ہے ... سنو سنو سنو لہو گرجتا ہے)

نظم "پال تزادرہ" (آبشار) اوّل سے آخر تک صوتیات پر ہی پیش کی گئی ہے۔

نادمؔ صاحب کا کشمیری ذخیرۂ الفاظ ایک بے انتہا سمندر ہے۔ وہ شعر کہنے کے لیے الفاظ ایجاد نہیں کرتے بلکہ بے شمار الفاظ ان کی جھولی میں سما کر خود اُن سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں کو استعمال کرو۔ ان کے اشعار اور ان کے برتاؤ میں کوئی لفظ یا ترکیب جوڑی ہوئی چیز محسوس نہیں ہوتی، جو ایک بڑے شاعر کی پہچان ہے۔

نادمؔ صاحب نے تقریباً چار سو سے زائد نظمیں، غزلیں، سانیٹ، حادثات زتنہ اور ہائیکو وغیرہ تخلیق کئے ہیں۔ لیکن تاحال اُن کا فقط ایک شعری مجموعہ "شہلی کُل" ؎ سامنے آچکا ہے جو اُن کا نمائندہ مجموعہ نہ ہونے کے علاوہ پروف ریڈنگ نہ ہونے کی وجہ سے غلطیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ ان اصنافِ شعر کے علاوہ انہوں نے بہت سے اوپیرا بھی لکھے ہیں جو سٹیج کئے گئے یا ریڈیو سے نشر ہوئے۔ ان میں سے "بمبور یمبرزل" "وِلستا" اور "نیکی بدی" وغیرہ زیادہ کامیاب اور مقبول ہوئے۔ "بمبور یمبرزل" نامی کا اوپیرا روسی زبان میں سوویت یونین میں بھی سٹیج پر کھیلا گیا۔ اُن کا یہ تمام شعری سرمایہ اور شعری عظمت زیرِ نظر رکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ "نادمؔ یگ" ابھی نہ جانے کتنے دنوں تک چلتا رہے گا۔ ○

○ — (کشمیری سے ترجمہ۔ مترجم: ظفر مظفر)

؎ نادمؔ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا تھا

مولانا عبدالرسول خانقاہی

کشمیر کے ایک گمنام مگر ممتاز فارسی شاعر مولانا عبدالرسول خانقاہی کو فارسی زبان کے مُسلمہ اُستاد اور عظیم شاعر مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے ساتھ وابستہ کرکے نہ اپنی کم مائیگی کا اظہار کرتا ہوں اور نہ کسی طرح کے احساس کمتری کے مُظاہرے کا مُرتکب سمجھتا ہوں۔ ہاں ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

کسی غیر معروف شخصیت کے اَدبی مقام کا تعیّن کرنے کے لئے معروف و مشہور شخصیات کا سہارا لینا کسی حد تک ضروری بنتا ہے مگر ایسی وابستگی میں معقولیت لازمی ہے۔ مولانا خانقاہی کے نعتیہ کلام میں وہی سوز و گداز، خلوصِ اظہار اور خیال آفرینی موجود ہے جو حضرتِ جامیؒ کے نعتیہ کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ بھی جامی کی طرح عشقِ رسولؐ سے تڑپتے رہے ہیں اور اُسی حد تک اُنہیں حضرتِ علمائے کشمیرؒ کے ساتھ بھی والہانہ عشق

رہا ہے ۔ حُبِّ علمدار سے سرمست ہو کر اپنے آپکو "حسانِ شیخ"
کے لقب سے بھی مُلقب کیا ہے ؎

اے رسول در شعر خود دم در مکش در خورِ تحسین بود حسانِ شیخ

اِس لئے نقد و نظر سے پہلے قارئین کو مولانا کے کلام
سے روشناس کرانا لابدی بنتا ہے ۔

آپ نے متعدد مناجات نظم کئے ہیں ۔ چونکہ آپ کا
کلام عام لوگوں تک نہیں پہنچا ہے اسلئے ضروری سمجھتا ہوں کہ
اس کو آگے بڑھانے سے پہلے قارئین کو اُن کے رنگ و اسلوب
سے متعارف کرانے کیلئے چند اشعار یہاں پر نقل کروں ؎

اے اسیرانِ تو از دارین عتیق عاشقانت مست سرجوش رحیق
من گرفتارم بہ صد بندِ مضیق خُود ندارم جُز تو در عالم رفیق
نجّنا مِنْ کُلِّ ضیقٍ یا شفیق

ہر کسے نازاں بر کردارِ خُود است اعتبارِ ہر کس از کارِ خُود است
بندۂ مسکین گرفتار خُود است شہر بندِ چار دیوار خُود است
نجّنا مِنْ کُلِّ ضیقٍ یا شفیق (۱۸ بند)



کُن کرم پروردگارم اَنْتَ خیرُ الاکرمین
فتحیابِ کار و بارم اَنْتَ خیرُ الفاتحین
گر گُناہ و معصیت بے حد و عد ورزیدہ ام
یادِ غُفرانِ تو یارب اَنْتَ خیرُ الغافرین
(۱۱۳ ابیات)



اے کم ہستی میانِ عالم طاق ... در جوان مردی و وفا و وفاق
بے تکلف شدہ احادیث ... مر کلامِ قدیم را مصداق
مصرع بینی تو در خوبی ... ہست چوں بیتِ ابروانِ طاق

(۲۸ ابیات)

○

اے ترا ملک[2] دو عالم یک قلم زیرِ نگین ... صد سُلیمان ہمچو سلمان بد درت سایہ جبین
گر بہ صورت احمدی اما بہ معنائے احد ... اسم تو خیر الرسل عتیم تو ختم المرسلین
پایۂ معراج موسیٰ زیں جہاں گر پارہ ... حجلہ خلوت سرائے خاصِ تو عرش بریں
عیسیٰ مریم برائے دستِ بیسوں یک قدم ... از زمین آمد بہ چرخ از چرخ آید بر زمین

(۱۹ اشعار)

○

خاطرم تنگ و تار شُد چہ علاج ... مراتم زنگبار شُد چہ علاج
خار زارِ تردُدم سر زد ... دامنم تار تار شُد چہ علاج
نو بہارے ندیدہ گلبنِ من ... ریختہ برگ و بار شُد چہ علاج

○

صرف شُد عمرِ گرامی پئے نادانی چند ... پر نہ نازانِ دغا بازِ ہوس رانی چند
لُطفِ ساقی چو بُود جام بہ کامم گردد ... پائے خُم جائے دہد دُور بہ رندی چند

○

نظم المناقب مثنوی سے چند شعر

تر زبان شو خامۂ مشکین رقم ... تا سر تا قدم
صفحہ را در مشک تر آغشتہ کُن ... گوہرِ منظوم را در رشتہ کُن
رشکِ صحرائے ختن کُن صفحہ را ... تختگاہے خویشتن کن صفحہ را
منقبت نثر است منظومش نما ... سُفتہ کُن آن گوہرِ ناسُفتہ را

شاعران اشعارِ رنگین گفتہ اند صحنِ گلزارِ سخن خوش رفتہ اند
ایں سعادت ماندہ باقی ازہمہ ایں غزالہ رم نمودہ از رمہ

○

آپ کا نام عبدالرّسول تھا اور فخراً اپنے آپ کو خانقاہی لکھتے تھے۔ اِس لئے آپ کی اصل سکونت کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ چونکہ آپ کا کلام اور تمام شاعری چرارِشریف میں ہی محفوظ اور موجود ہے۔ اِس لئے آپ کا اسی قصبہ کیساتھ وابستہ ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ یہاں پر بھی مختلف رِوایات سُننے میں آئی ہیں۔ موجودہ وقت میں مولانا مرحُوم کی ذات اور اَدب سے شاید قصبہ بھر میں میرے سِوا زیادہ کوئی واقف نہیں۔ البتہ میں نے شب خوانی کے دوران چرارِشریف کے خوش لحن فاتحہ خواں حاجی غلام حسن مجید سے ان کی ایک نعت اور ایک منقبت شیخ العالمؒ سُنی ہے۔ شاید اُن کے گھر میں بھی اُن کا کلام موجود ہوگا۔ مگر مولانا صاحب کے نام کے ساتھ "خانقاہی" جُڑے ہونے سے اگرچہ اس خیال کو تقویت مِلتی ہے کہ کہیں اصل میں آپ سرینگر کے محلہ خانقاہِ معُلّی کے رہنے والے تو نہیں تھے اور چرارِشریف میں یا تو پسر پروردہ لائے گئے تھے یا پھر بطور خانہ داماد۔ اگر ایسا ہوتا تو خانقاہ معلّی سرینگر کے مولود خوانان کے پاس بھی ضروری طور آپ کا کچھ نہ کچھ کلام موجود ہوتا اور وہاں کی انجمن مؤذنین نے آپ کی کوئی نعت، مناجات یا منقبت "نالۂ بیدلاں" موسوی

رسالہ میں ضرور شایع کی ہوتی چرارِ شریف میں یہ روایت بھی مشہور رہی ہے کہ مولانا صاحب کا آبائی گھر چرارِ شریف کی ہی خانقاہ فیض پناہ کے متصل تھا اور اسی مناسبت سے خانقاہ لکھتے تھے۔ دونوں روایات راقم نے اپنے والد مرحوم سے سُنی ہیں مگر دونوں محض مبنی بر قیاس ہیں جب کہ حقیقت یوں ہے آپ قصبہ چرارِ شریف کے ہی چشم و چراغ تھے۔ البتہ آپ کے اُستاد خانقاہ مُعلّٰی سرینگر کے عالم و عارف مُلّا عطاؤ اللہ خانقاہی تھے۔ آپ اپنے پیر و مُرشد کے اس حد تک معتقد رہے ہیں کہ اپنی شخصیت کو بھی اُنہیں کی مناسبت سے تشخص دیا۔ حصولِ علم کے دوران آپ اکثر اپنے پیر بزرگ کے ہی گھر رہا کرتے تھے اور سلک و معرفت کے منازل طے کرنے کے دوران خانقاہِ امیر کبیرؒ میں ہی چلہ کشی کرتے تھے۔ اسی تناسب سے اپنی مثنوی "نظم المناقب" حضرت امیرؒ کی خدمت میں یوں عرض کرتے ہیں ؎

در گُلستان جنابم مسکنم بر گُلِ اُو نالۂ بُلبل زنم

آپ کے اُستاد بھی خود عارف باللہ اور عالم و فاضل ہونے کے علاوہ عاشق رسولؐ تھے۔ آپ کا کچھ نعتیہ کلام بھی مولانا عبدالرّسول کے نعتوں کے ساتھ شامل ہے۔ ایک نعت کے چند شعر ہدیۂ قارئین ہیں ؎

اے شاہِ مُرسلاں بہ فضلِ اللہ صلی اللہ علیک یا رسول اللہ
وے شفیع الاُمم باذنِ اللہ صلی اللہ علیک یا رسول اللہ

اے عطائی مترس از دوران ۔ حامئی تست در زمین و زمان
مُصطفٰے مُجتبیٰ شہے دوران ۔ صلّی اللہ علیک یا رسول اللہ

مولانا عبدالرسول صاحب کے سنِ ولادت کے بارے میں ابھی تک مجھے کوئی معلومات فراہم نہیں ہوئیں اور ہوں بھی کیسے جبکہ ابھی تو معلوم نہ ہو سکا کہ آپ چرارِ شریف کے کس خاندان کیساتھ وابستہ تھے ۔ میں تو ابھی تک آپ کے جانشینوں کے بارے میں بھی کوئی معلومات حاصل نہ کر پایا ۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ مولانہ صاحب ۱۲۱۴ھ میں بھی بقیدِ حیات تھے ۔ اُس سال آپ نے اپنی مثنوی " نظم المناقب " مکمل کی ہے جس کا سال تصنیف بھی اسکے نام سے ہی نکلتا ہے ۔

نامِ او نظم المناقب داشتم ۔ سالِ او از نام او برداشتم

۱۸۰۵ء ۔ ۱۸۰۶ء میں عطا محمد خان نے بحیثیت گورنر کشمیر اپنا عہدہ سنبھالا ۔ اُس سے قبل شاید عبداللہ خان کی صوبیداری کے دوران قصبہ چرارِ شریف پورے کا پورا نذرِ آتش ہُوا تھا ۔ روایت بہت مستحکم اور مستند ہے کہ اس ہولناک آگ کے اختتام پر سب باشندہ گان صحن پاکِ زیارت علمدارؒ میں جمع ہوئے اور شکایت کی کہ " آقا ہمیں تو بے گھر کیا مگر اپنے گھر کو محفوظ رکھا " کہتے ہیں کہ دفعتاً پھر آگ نمودار ہوئی اور سُلطان زین العابدین کی تعمیر کردہ خانقاہ بھی شعلوں کی لپیٹ میں آگئی اور آستان شریف بھی نذرِ آتش ہُوا ۔ اولاً علی شاہ چک کے تعمیر کردہ اُس خوبصورت غلام گردش نے آگ پکڑلی جسمیں درجنوں نقش و نگار والے دیو دار لکڑی کے ستون

نصب تھے جن پر سالہا سال کشمیر بھر کے کاریگروں نے باغ و بہار کے فردوس آفرین نظارے منقش کئے گئے تھے۔ پھر عطا محمد خان گورنر نے خانقاہ معلّی کی تعمیر کا ازسرنو انتظام کیا۔ جیّد کشمیری اور مولانا عبدالرسول دو عظیم ہمعصر شاعروں نے اس تعمیر نو پر نظمیں لکھیں ہیں جن کے آخری اشعار سال تعمیر خانقاہ کے مادۂ تاریخ ہیں۔ ایک ایسی ہی نظم کے آخری دو شعر ہیں ؎

یگفتا ہاتفی تاریخ سالِ او بہ حالِ دِل
"زیبا و بجا ایں خانقاہ قطبِ رُبانی"

دوسری نظم کا آخری شعر ہے ؎

گُفت از بیدِ سالِ تاریخش ہاتفی "قلعہ بسا مضبوط"

اِسطرح مولانا ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۱ء) میں بھی بقیدِ حیات تھے۔

مولانا صاحب کی جُملہ تخلیقات میرے دادا مرحوم نے حاصل کیں اور اُن کو نقل کر کے اصل نسخے مولانا کے وارثان کو واپس کئے۔ دادا جان خوش خط تھے۔ اُن نسخہ جات تک میری تادم تحریر رسائی نہ ہوسکی البتہ جو خزینہ ہمارے پاس ہے وہ ۱۹۶۵ء کی آگ کیوجہ سے اِسطرح بکھرا ہوا ہے کہ اس کی شیرازہ بندی کلارے دارد والا معاملہ ہے۔ مگر اس کی مثنوی نظم المناقب کیساتھ ایک مخمّس طویل نظم بھی تھی ہو چکی ہے۔ لگتا ہے کہ آپ نے ایک خاصا اچّھا رِسالہ اخلاقیات پر تصنیف کیا تھا اور یہ اوراق اُسی کے جُز ہیں۔ رِسالے کا نام درج نہیں ہے۔ اِبتدائی اوراق بھی شامل نہیں ہیں لیکن آخری اشعار یوں ہیں ؎

منہ دِل بریں مسکن اژدہا بزن بر سرس دفقۂ پُشت پا

رسولا شو پیشہ بہرِ خدا کہ مے آید از آسمانم ندا

منہِ دل بریں کہنہ فانی سرا

اسی رِسالہ کے آخری صفحہ پر اختتامِ نظم کے بعد آٹھ اشعار پر ایک مختصر نظم در توصیف "تعمیر قلعہ و بنگالہ" درج ہے۔ اسکے آخری شعر سے اُس قلعہ اور مُسافر خانہ کی تعمیر کا سال اخذ ہوتا ہے جو آستان زیارت چرار شریف کے جانب شمالی تعمیر ہوا تھا۔ وہ قلعہ اگرچہ اب موجود نہیں ہے مگر اُس بازار کو "قلعہ بازار" ہی کہتے ہیں بلکہ محلہ کا نام بھی یہی ہے۔ شعر یُوں ہے ؎

حال دیدم سال پُرسیدم سروش از غیب گفت

"نو تابد از لب و بام وبن و دیوار و در"

اگرچہ یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ کاتب مرحوم نے تحریر نہیں کیا ہے کہ یہ نظم مولانا رسول کی ہے یا اور کسی شاعر مگر چونکہ مولانا کے دیگر کلام کے ساتھ منسلک ہے اور اسلوب بھی انہیں کا ہے اس لئے میری رائے میں یہ نظم بھی عبدالرسول صاحب کی ہی ہے۔ اور اسطرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ وہ سنہ ۱۲۱۴ھ (سنہ ۱۸۳۴ع) میں بھی بقیدِ حیات تھے۔ راقم کی رائے میں مولانا صاحب کشمیر میں سکھوں کی حکومت کے قیام کے فوراً بعد وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے کشمیر پر ظلم و تشدد کا پورا دور دیکھا ہے اس حقیقت کے باوجود کہ پٹھان عہد میں حاکموں اور عام افغانوں کو دربار علمدار کے ساتھ خصوصی عقیدت رہی ہے اور

خود مولانا عبدالرسول کو عطا محمد خان کے ساتھ باریابی بھی حاصل تھی پھر بھی ایک باشعور کشمیری کی حیثیت سے پٹھان عہد کے کشمیر کو آپ نے "ظلم آباد" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ایک نعت بحضور سرور کائنات یوں اس ظلم کے خلاف فریاد کرتے ہیں ؎

من آن مظلومِ دلگیرم کہ از سر رفتہ تشویرم
ز ظلم آباد کشمیرم بافغان یا رسول اللہ
ز حد شد جورِ افغانان فغان از دورِ افغانان
تو دستِ زورِ افغانان بہ پیچان یا رسول اللہ

مولانا صاحب کے اُستاد بھی عربی اور فارسی زبانوں اور اَدب پر دسترس رکھتے تھے اور بحیثیت ہوشیار شاگرد آپ نے بھی ان زبانوں پر کمال حاصل کیا تھا۔ اس طرح آپ نے اپنے اُستاد عطاؤ اللہ خانقاہی سے علم ریاضی، نجم و رمل، صرف و نحو، فقہ و حدیث اور علم کلام میں پوری مہارت حاصل کی تھی۔ اپنے اُستاد کے فضل کے یوں مدّاح ہیں ؎

در رہش جولاں زنم از پائے چشم	جائے او چوں مردمک بالائے چشم
در برِ او کودک افلاطون بود	قطرۂ آبی دُرِّ مکنون بود
بحر بخشِ ابر ریزش طبع او	یک فن اندر جملہ فن بے گفتگو
در دبستان ادب تعلیم جو	تاہ زدی زانوار سطو پیش او
جسم اقلیدس دو چشم افروختی	خط و سطح و نقطہ زو آموختی
نیستن زیں عالم پُر وسوسہ	ثانی در بیہات و در نیدسہ

مثنوی نظم المناقب :- یہ مثنوی کُل دو ہزار دو سو ابیات پر مشتمل

منہ دِل بریں مسکن اژدہا بزن برسرس دفقۂ پُشت پا

رسولا شو پند بہر خدا کہ مے آید از آسمانم ندا

منہِ دل بریں کہنہ فانی سرا

اسی رِسالہ کے آخری صفحہ پر اختتام نظم کے بعد آٹھ اشعار پر ایک مختصر نظم در توصیف "تعمیر قلعہ و بنگالہ" درج ہے۔ اسکے آخری شعر سے اُس قلعہ اور مسافر خانہ کی تعمیر کا سال اخذ ہوتا ہے جو آستان زیارت چرار شریف کے جانب شمالی تعمیر ہوا تھا۔ وہ قلعہ اگرچہ اب موجود نہیں ہے مگر اُس بازار کو "قلعہ بازار" ہی کہتے ہیں بلکہ محلہ کا نام بھی یہی ہے۔ شعر یُوں ہے ؎

حال دیدم سال پُرسیدم سروش از غیب گُفت

"نو بتابد از لب و بام و بن و دیوار و در"

اگرچہ یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ کاتب مرحوم نے تحریر نہیں کیا ہے کہ یہ نظم مولانا رسول کی ہے یا اور کسی شاعر مگر چونکہ مولانا کے دیگر کلام کے ساتھ منسلک ہے اور اسلوب بھی انہیں کا ہے اس لئے میری رائے میں یہ نظم بھی عبدالرسول صاحب کی ہی ہے۔ اور اسطرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ وہ ۱۲۱۴ھ (۱۸۳۴ء) میں بھی بقیدِ حیات تھے۔ راقم کی رائے میں مولانا صاحب کشمیر میں سکھوں کی حکومت کے قیام کے فوراً بعد وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے کشمیر پر ظلم و تشدد کا پورا دور دیکھا ہے اس حقیقت کے باوجود کہ پٹھان عہد میں حاکموں اور عام افغانوں کو دربار علمدار کے ساتھ خصوصی عقیدت رہی ہے اور

خود مولانا عبدالرسول کو عطا محمد خان کے ساتھ باریابی بھی حاصل تھی پھر بھی ایک باشعور کشمیری کی حیثیت سے پٹھان عہد کے کشمیر کو آپ نے "ظلم آباد" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ایک نعت بحضور سرور کائنات یوں اس ظلم کے خلاف فریاد کرتے ہیں ؎

من آن مظلوم دلگیرم کہ از سر رفتہ تشویرم
زظلم آباد کشمیرم بافغان یا رسول اللہ
زحد شد جور افغانان فغان از دور افغانان
تو دست زور افغانان بہ پیچان یا رسول اللہ

مولانا صاحب کے اُستاد بھی عربی اور فارسی زبانوں اور ادب پر دسترس رکھتے تھے اور بحیثیت ہوشیار شاگرد آپ نے بھی ان زبانوں پر کمال حاصل کیا تھا۔ اس طرح آپ نے اپنے اُستاد عطاؤ اللہ خانقاہی سے علم ریاضی، نجم ورمل، صرف ونحو، فقہ وحدیث اور علم کلام میں پوری مہارت حاصل کی تھی۔ اپنے اُستاد کے فضل کے یوں مدّاح ہیں ؎

در رہش جولاں زنم از پائے چشم جائے او چوں مردمک بالائے چشم
در بر او کودک افلاطون بود قطرۂ آبی دُرّ مکنون بود
بحر بخشش ابر ریزش طبع او یک فن اندر جملہ فن بے گفتگو
در دبستان ادب تعلیم جو تاہ زدی زانو ارسطو پیش او
جسم اقلیدس دو چشم افروختی خط و سطح و نقطہ زو آموختی
نیستن زیں عالم پُر وسوسہ ثانی در بیہات و در نیدسہ

مثنوی نظم المناقب :- یہ مثنوی کُل دو ہزار دو سو ابیات پر مشتمل

ہے۔ آپ خود رقمطراز ہیں کہ اس کا مضمون نثر میں تھا تو آپ نے اُس کو نظم کا پیرہن پہنایا۔ اس نظم میں آپ نے حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کے ساتھ وابستہ حقائق و واقعات کو بیان کیا ہے۔ رنگ اکثر تمثیلی ہے اور ان تمثیلوں میں بیش بہا رموز و اَسرارِ مسلک و معرفت بیان کئے گئے ہیں۔ جیسا بیان کر چکا ہوں کہ سال ۶۵ کی پہلی رات میں آگ لپیٹوں نے اس نادر نسخہ کو گھیرا تھا اور والد مرحوم نے سب کچھ داؤ پر لگا کر ان نودرات کو بچانے کی سعی کی، بایں ہمہ شیرازہ بندی غلط ہوئی اور اِدھر اُدھر کے اوراق مل گئے جس کیلئے ترتیب نو انشاء اللہ کر کے اِسے زیور طبع سے آراستہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تاریخی پس منظر میں آغاز داستان کے باب میں سے چند شعر نمونہ کے طور پیش ہیں ؎

از جواہرہائے گنجِ حیدری	بر کشم من گوہری اے مُشتری
کانچہ او بر صفحہ آوردہ پدید	از امیر بر رشِ آبادی شنید
بود عبداللہ نام او امیر	در ولایت نامدار بے نظیر
وے ز اصحاب سیادت و شگا	بانئی اسلام شاہِ دین پناہ
جُملہ عادات و خوارق را شنید	بعضے آنرا ال بہ چشم خویش دید
اے رسول اکنوں قلم را تیز راں	منقبت لفظاً بہ لفظاً کُن بیاں
خرقِ عاداتِ شریفش کُن رقم	تا بماند یادگاری از توہم
ور مدد از غیب جوئی پیر ہست	دولتِ سیّد علی ہر چیز ہست
چوں نمائی مدح سیّد ورد جان	مشکلت آساں شود طبع رواں
از ملا قاتش بشارت دہ مرا	و از اجازت ہم اشارت دہ مرا

اولاً از شیخنا محمود گو چوں شدش با سید ما گفتگو

باز گو تعبیر خوش خواب امیر از ریاضات امیر از حکم پیر

رسالۂ اخلاقیات نظم مُخمّس :۔ جیسے عرض کر چکا ہوں کہ اس رسالہ کا نہ تو نام وغیرہ ہی درج ہے نہ اس کا سالمہ نسخہ تا ایں دم دستیاب ہو سکا اس لیئے اس پر کوئی تبصرہ کرنا یا اس سلسلے میں کوئی تذکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ البتہ نمونہ کے طور پر دو آخری بند ہدیہ کرتا ہوں ؎

منہ دِل بریں طرح دانہ دار کہ ناگاہ پیچد بیار رِشتہ دار

منہ دِل بریں گنبدِ بیقرار منہ دِل بریں دیر ناپائیدار

زِ سعدیؔ ہمیں یک سُخن یادوار

منہ دِل بریں مسکن اژدہا برں برسرش دفقہ پُشت پا

رسولا شنو پند بہر خُدا کہ مے آید از آسمانم نِدا

منہ دِل بریں کُہنہ فانی سدا

اس نظم میں خانقاہی صاحب نے پند و نصائح کے موتی بکھیر دئے ہیں۔ مضامین یُوں ہیں "در ترک ظلم و مذمت ظالمان"۔ "در باب قناعت توکل و تسلیم و رضا"۔ "در مذمت حرص و حریص مال و بد قسمتی سے یہ مُخمّس نظم حضرت سعدیؔ شیرازی کے ایک قلمی نسخہ کے ساتھ جِلد ساز کی غلطی کی وجہ سے نتھی ہوئی ہے اس لئے اس میں سے وہی بند نمونہ کے طور پر پیش کئے جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نظم مولانا عبدالرسول صاحب حضرتِ سعدیؔ کی ہی زمین میں اور اُنہی کی تقلید میں لکھی ہے۔

سوز و گداز، عشقِ رسولؐ کے خلوص بھرے جذبات اور معنی آفرینی کے جوہر مولانا عبدالرّسول خانقاہی کی نعت کا خاص اسلوب ہے۔ آپ کی مناجاتی نظموں سے انکساری اور عاجزی ٹپکتی ہے۔ جب کہ ربِّ جلیل کی بے نیازی، بندہ پروری اور اُن کی رحیم و شفیق ہونے کی مدحسرائی مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ آپ کی فنکارانہ صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ اُن مناقب میں ہوتا ہے جو آپ نے حضرت شیخ نورالدّین ولیؒ کے عشق و عقیدت میں تخلیق کئے ہیں۔ نظمُ المناقب مثنوی میں مولانا بحیثیتِ تمثیل نگار اور صوفی شاعر کے فلسفیانہ رموز کی گھتیاں سلجھا رہے ہیں۔

کچھ اور شعر آپ کی نعتوں اور مناقب سے بطور نمونہ پیش ہیں

درشب اسریٰ بعبدہٖ برکمال عزت	از ملک طوبیٰ لک آمد، از فلک صدآفریں
قابِ قوسین پایہ ادنیٰ بُوداز قربِ تو	درشبِ معراج چوں در لامکاں گشتی مکیں

یا

آئنہ سکندرو آبِ حیات خضر	نورِ جبین و لعلِ شکر خائے مصطفیٰؐ
عیسیٰ دبیرو دائرہ عُلوی مقامِ اوست	شُد پردہ دار ذروہ علیائے مصطفیٰؐ
معراجِ وشبِ قدر اصفیا	گیسوئے روز پوش قمر سائے مصطفیٰؐ
ادریسؑ کو مدرس درسِ معارف است	لب تشنہ پیشِ منطقِ گویائے مصطفیٰؐ

مناقب حضرت شیخ میں سے کچھ ابیات:۔

دِلا گو دولت و اقبال میخواہی بیا اینجا	سعادت خانہ زاد و سایہ پروہما اینجا
بپا رفتن پسندِ ہوشمند راہ رو نبود	کہ عین فرض داند گر کُند از دیدہ پا ایں جا
نفس کُن درحریم راز پاک از بُوئے غمازی	کہ نبود راہ رفتار چناں بادِ صبا ایں جا

زقندیلِ فروزاں روضۂ تاباں پس از موسیٰ ﷺ ید بیضا بنور و طور و سینا ہا پناہ ایں جا

یا

ایستادہ بردست پاشاہ نورالدّ بیا عرضِ درباں میدہم ما فی الضمیر و مُدعا
گوہرِ دُرجِ زُہادت اختر بُرجِ ورع لعل کانِ اتقیا، ارحم لنا، ارحم لنا
والئ مُلکِ ولایت پادشاہِ دین پناہ عالمِ علمِ لدنّی عاملِ صدق و صفا

یا

بسملم از تیغ جورو دورِ دوں دیدہ حیران دلِ طپاں تن غرقِ خون
در جنابِ تو رسانیدم کنون خاطرِ محزون و قلب بے سکون
از نگاہ جانفزا دستم بگیر



میں ایک دور شروع ہوا جب ریاست میں بالعموم اور جموں میں بالخصوص بیرونِ ریاست کے لوگوں کی یلغار شروع ہوگئی اور ریاستی باشندوں کے لئے مُلازمت کے دروازے بھی بند ہوگئے ۔ ایسے دَور میں محبِ وطن لالہ ہنسراج مہاجن اپنے وکیل دوست صاحب زادہ حضرت شاہ سے ملکر ایک ایسی سبھا یا انجمن قائم کرنے کی تجویز بنائی جو ریاست کے لوگوں کی بلا لحاظ مذہب و ملّت بہتری کی تجاویز پیش کرے ۔

چنانچہ اِن دونوں وُکلا نے ملکر ایک پبلک میٹنگ بُلائی جس میں تقریباً سات سو اہلِ ہنود و اہلِ اسلام موجود تھے ۔ یہ میٹنگ ۳۱ جیٹھ ۱۹۶۱ بکری (۱۹۰۴ء) کے دِن منعقد ہوئی ۔ ڈوگرہ سبھا کے پُرانے رجسٹر میں لالہ ہنسراج مہاجن کے قلم سے مندرجہ ذیل غرض و غایت درج ہے :-

"منجانب ہنسراج مہاجن و حضرت شاہ وکیل صاحبان !

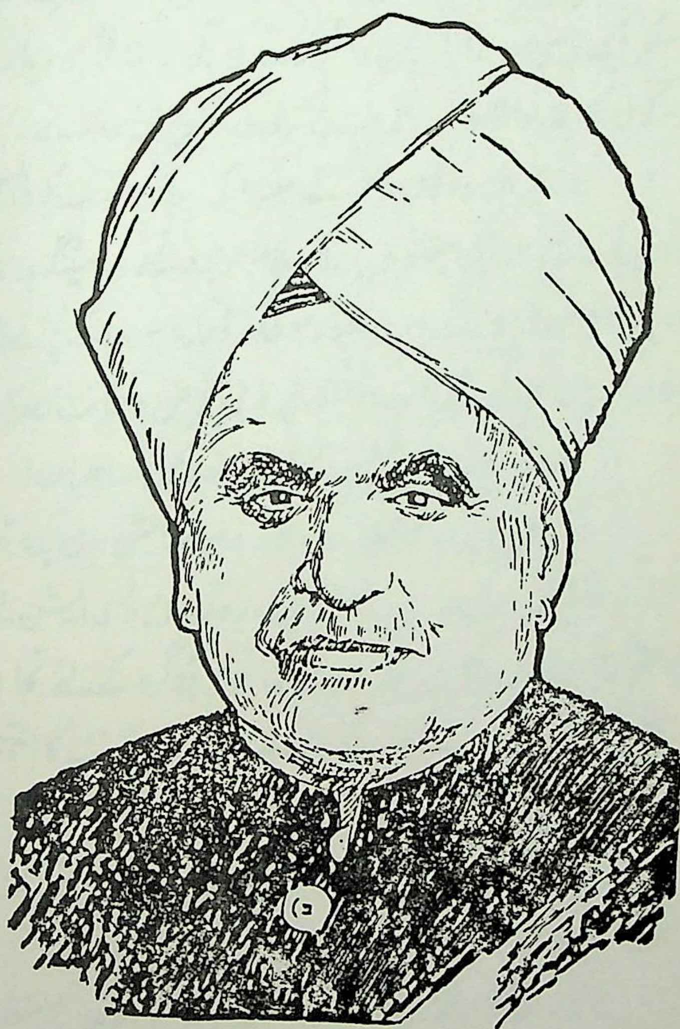
ڈوگرہ رعایا کی حالتِ روزگار وجہ معاش دِن بدن تنزل کی صورت اختیار کر رہی ہے ۔ اِسلئے ایک ڈوگرہ ایسوسی ایشن یعنی کمیٹی مقرّر کی جاوے جو بہتری و بہبودیٔ قوم ڈوگرہ کے لئے تجاویز سوچے گی ۔ اوّل آج کے جلسہ کے لئے صاحب پریذیڈنٹ کا اِنتخاب کیا جاوے ۔

با اتفاق رائے پنڈت گنیش شاستری صاحب پریذیڈنٹ جلسہ ہذا مقرّر کئے جائیں ۔"

یہی رجسٹر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو بغرض عطائے منظوری قائمی سبھا بھیجا گیا جس پر لالہ ہنسراج مہاجن نے لِکھا :-

"ڈوگرہ ایسوسی ایشن جسکے ممبران بلا لحاظ ذات و فرقہ صِرف





لالہ ہنسراج مہاجن

باشندگان رعایا ریاست مقرّر ہو سکیں گے اور جس کا صدر مقام جموں میں ہوگا" قائم کرنے کی اجازت دی جائے"۔

اسکے آگے پنڈت دیا کشن کول پرائیویٹ سیکریٹری کے قلم سے مندرجہ ذیل حکم درج ہے:۔

ملاحظہ شد ۳۰ پھاگن ۱۹۶۲ بکری

اغراض کمیٹی پسندیدہ ہیں ۔ اگر اِن اصولوں پر ڈوگرہ کمیٹی کوشاں ہے تو قوم اور مُلک کو ضرور فائدہ پہونچے گا۔

تحریر صدر بقلم دیا کشن کول
پرائیویٹ سیکرٹری

(دستخط) پرتاپ سنگھ
مہاراجہ

جو سرکار والا نے تحریر فرمایا ہے اُس کی تائید کرتا ہوں۔

(دستخط) راجہ امر سنگھ
(دستخط) مقبول حسن ۔ ریونیو منسٹر
(دستخط) نریندر ناتھ کول گورنر جموں

•

ڈوگرہ کمیٹی کے عہدہ داران کا انتخاب ۶ ہاڑ ۱۹۶۱ بکری کو ہوا ۔ مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے:۔

پریذیڈنٹ ــــ پنڈت گنیش شاستری
وائس پریذیڈنٹ ــــ میاں جوالا سنگھ پُرانی منڈی والے اور شیخ علی محمّد سوداگر
سیکریٹری ــــ لالہ ہنسراج

اسسٹنٹ سیکرٹری پنڈت منوہر ناتھ و صاحب زادہ حضرت شاہ
خزانچی ــــ لالہ جے رام شاہ سہگل
محاسب ــــ لالہ لوک ناتھ کپور ساہوکار

۱۰ بھادوں ۱۹۶۲ بکری کو ڈوگرہ کمیٹی کی دوبارہ میٹنگ بلائی گئی جس میں پنڈت گنیش شاستری پردھان کے سرگباش ہونے کا اظہار افسوس کیا گیا اور جیوتشی وشویشور پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔

جیوتشی وشویشور پریذیڈنٹ نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے ڈوگرہ کمیٹی کا اخبار "ڈوگرہ گزٹ" شائع کرنے کی منظوری حاصل کرلی۔ ماہ پھاگن ۱۹۶۳ بکری (۱۹۰۶ء) میں اس اخبار کا پہلا پرچہ منظر شہود پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر لالہ ہنسراج مہاجن تھے۔

لالہ ہنسراج مہاجن نے جس سیاسی سوجھ بوجھ سے ریاست کی اوّلین عوامی سبھا قائم کی اس کا عام لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ لالہ صاحب نے سارے صوبہ جموں کا پیدل دورہ شروع کیا اور اُن کی مساعی جمیلہ سے کٹھوعہ۔ اُدھم پور۔ ریاسی۔ سانبہ وغیرہ مقامات پر سبھا کی شاخیں قائم ہوئیں۔ اس لئے ڈوگرہ کمیٹی کا نام بدل کر ڈوگرہ صدر سبھا رکھا گیا۔

ڈوگرہ صدر سبھا ہی ایک ایسی جماعت تھی جس نے سرینگر شہر میں بھی اپنی شاخ قائم کی۔ اس برانچ میں جو رہنما کام کرتے تھے اُن میں پنڈت جیا لعل کلم۔ پنڈت بلہ کاک در۔ آغا سعید حسین۔ پنڈت چندر جُو ایڈووکیٹ اور پنڈت نند لعل واریکو شامل تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈوگرہ صدر سبھا کے نقطۂ نظر

میں بھی تبدیلی آنے لگی ۔ تاریخ گواہ ہے کہ ریاست میں اسمبلی قائم کرنے اور پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی کے لئے بھی پہلی آواز ڈوگرہ سبھا نے ہی اُٹھائی ۔

۱۹۲۹ء کے سالانہ جلسہ کی صدارت پنڈت جیالعل کلم ایڈووکیٹ نے کی ۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں نمائندہ اسمبلی قائم کرنے کے حق میں زوردار آواز بلند کی ۔ ڈوگرہ سبھا کے اٹھارویں سالانہ اجلاس میں، جسکی صدارت سردار بُدھ سنگھ جی کر رہے تھے، سبھا کے صدر پنڈت سری نورس شاہ منگوترہ نے تجویز پیش کی کہ ریاست میں فوری طور اسمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے ۔ اسکی تائید سعید اسد اللہ شاہ وکیل اور لالہ مُلک راج صراف نے کی ۔ پنڈت جیالعل کلم، مہاشہ رام چند اور شیخ عبدالحق ڈوگرہ نے قرارداد کے حق میں زوردار تقریریں کیں ۔ جب کہ ٹھاکر کاہن سنگھ بلاوریہ، ٹھاکر پنجاب سنگھ، ٹھاکر سوچیت سنگھ اور لالہ روپ چند نندہ نے قرارداد کی مخالفت کی ۔ تاہم قرارداد کثرت رائے سے پاس ہوئی ۔

ڈوگرہ سبھا کے ایک اجلاس میں لالہ مُلک راج صراف نے ریزولیوشن پیش کیا کہ ریاست میں انجمن سازوں اور پبلک جلسوں پر پابندیاں منسوخ کی جائیں ۔ یہ تجویز پاس نہ ہو سکی ۔

لالہ ہنسراج مہاجن ایک مانے ہوئے سوشل ریفارمر تھے ۔ آپ نے شادی بیاہ کے مواقع پر غیر ضروری اخراجات بند کرنے میں بہت کارآمد تجاویز پبلک کے سامنے رکھیں ۔ یہاں تک کہ وہ شادی کے موقعہ پر جب روائتی ملنی ہوتی ہے خود موجود رہا کرتے تھے تاکہ

کوئی شخص ایک رُوپیہ سے زیادہ شگن نہ دے۔

مہاجن سبھا کیطرف سے بھی آپ نے ایک ماہوار رسالہ "نیتی پتر" جاری کیا اس میں زیادہ تر سوشل سُدھار کا پرچار ہوتا تھا۔

لالہ ہنسراج مہاجن صاحب دُور دراز علاقوں کا دورہ بھی کیا کرتے تھے اور جہاں کسی افسر کی دھاندلی کی شکایت ملتی وہ اُسکے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ چند افسروں کی شکایت پر حکومت نے ان کی زبان بندی کا حکم جاری کر دیا۔ جو کچھ عرصہ بعد واپس لے لیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں لالہ ہنسراج مہاجن کے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کیا گیا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس کا پس منظر یُوں تھا کہ ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس لاہور میں مُنعقد ہونے والا تھا اور ہنسراج مہاجن نے کانگریس کے سیکریٹری کو خط لکھا کہ ڈوگرہ صدر سبھا درحقیقت ریاست جموں وکشمیر کی کانگریس ہے۔ اسلئے ڈوگرہ سبھا کو اپنے ڈیلیگیٹ بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ کانگریس نے اپنے قواعد اور ضوابط کی رُو سے ڈوگرہ سبھا کو ڈیلیگیٹ بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ تاہم لالہ ہنسراج مہاجن کی یہ خط وکتابت مسٹر جی۔ ای۔ سی۔ ویکفیلڈ (جو مہاراجہ ہری سنگھ کے مشیرِ خاص تھے) کی نظروں میں بغاوت تھی۔ اسلئے انھوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کو مشورہ دیا کہ ڈوگرہ سبھا کو اس کی باغیانہ سرگرمیوں کی پاداش میں فوری طور بند کر دیا جائے اور لالہ ہنسراج

مہاجن کی باغیانہ کارروائیوں کے پیشِ نظر انہیں گرفتار کر لیا جائے اور بغاوت کا مُقدمہ چلایا جائے۔

چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۳۰ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک حُکم کے ذریعہ ڈوگرہ صدر سبھا پر پابندی عائد کر دی اور دوسرے حکم کے ذریعہ لالہ ہنسراج مہاجن کے خلاف بغاوت کے اِلزام میں مُقدمہ دائر کیا گیا۔

راجہ ہری کرشن کول نے پرائم منسٹر کا چارج سنبھالنے کے بعد ریاست کے حالات کا جائزہ لیا اور اُن کی سفارش پر مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ڈوگرہ سبھا پر پابندی کا آرڈر منسوخ کر دیا اور لالہ ہنسراج کے خِلاف دائر کردہ مقدمہ پھر واپس لے لیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈوگرہ صدر سبھا کا ایک تاریخی اجلاس سرینگر میں مُنعقد ہوا تھا۔ یہ اجلاس ۱۳، ۱۴، ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو باغِ دِلاور خان میں واقع سٹیٹ ہائی سکول کی بلڈنگ میں مُنعقد ہوا تھا۔ اِستقبالیہ کمیٹی کے چیرمین مُنشی اسد اللہ ایڈووکیٹ تھے اور سیکریٹری پنڈت جیا لعل کلم۔ پہلے روز باغِ دِلاور خان سے ایک عظیم صدارتی جلوس نکالا گیا جس میں سرینگر شہر کے متعدد ذی عزت اصحاب اور کارکنان ڈوگرہ سبھا شامِل تھے۔

جلسہ کی پہلی نِشست ۱۴ اکتوبر کو زیرِ صدارت مرزا غلام مصطفےٰ ریٹائرڈ وزیر وزارت منعقد ہوئی۔ اسد اللہ صاحب ایڈووکیٹ نے خطبۂ صدارت پڑھا اور پنڈت جیا لعل کلم نے سبھا

کی سالانہ رپورٹ پڑھی۔

جلسہ کی دوسری نشست سردار بہادر جنرل سمندر خان کی صدارت میں ہوئی۔ اِس اجلاس میں پاس کی گئی قراردادوں میں ایک تو یہ تھی کہ ڈوگرہ سبھا کے نام میں تبدیلی کی جائے کیونکہ لفظ "ڈوگرہ" سے ہر باشندہ ریاست کا مفہوم قدرے غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ تحریک پنڈت جیالعل کلم۔ خواجہ مظفر الدّین شہمیری نے تجویز پیش کی کہ میونسپل اصلاحات رائج کی جائیں۔ مشہور قصبوں میں نوٹیفائڈ کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ میاں نظام الدّین نے لازمی پرائمری تعلیم رائج کئے جانے پر زور دیا۔ پنڈت جیالعل کلم نے تجویز پیش کی کہ ریاست میں صنعتی اور زراعتی تعلیم رائج کی جاوے۔

اِس کے علاوہ انسداد شادی صغرسنی۔ تعمیر ہسپتال تپ دق۔ ترقی تعلیم نسواں وکئی دیگر ریزولیوشن پاس کئے گئے۔

لالہ ہنسراج صاحب ۹، جولائی ۱۹۳۶ء کو ریاستی پرجا سبھا کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ ضلع جموں کی یہ نشست چودھری چتر سنگھ ممبر پرجا سبھا کے انتقال پر خالی ہوئی تھی۔ بحیثیت ممبر پرجا سبھا اُنہوں نے زمینداروں کو ساہوکاروں سے لئے ہوئے قرضہ سے نجات دلانے، کنڈی علاقہ میں پینے کا پانی مہیا کرنے، تعلیم یافتہ بے کار نوجوانوں کو سرکاری ملازمت دئے جانے، ریاست میں پبلک سروس کمیشن کے قیام کی ضرورت، گھریلو دستکاریوں کو بڑھاوا دینے کی ضرورت اور ہریجنوں کی حالت سُدھارنے جیسے معاملات اُبھارے۔

لالہ ہنسراج مہاجن صاحب نے ڈوگرہ صدر سبھا کی بُنیاد اُس زمانے میں رکھی جب کہ ہر قسم کی تنظیمی سرگرمیاں شک و شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ انہوں نے عُمر بھر مجلسی بے انصافیوں اور ناخواندگی کے خلاف جدوجہد کر کے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرنے میں لاثانی کام کیا۔ وہ ایک دیش بھگت بُزرگ تھے جو ہر قسم کی تنگ نظری سے اُوپر تھے۔

لالہ ہنسراج مہاجن نڈرتا اور آتم وشواس کی زندہ تصویر تھے۔ آپ بھرتری ہری کے اِس قول کے پکّے اُپاسک تھے:۔

"دُنیا تعریف کرے یا بُرا بھلا کہے۔ موت آج ہی آجائے یا صدیوں کے بعد۔ دھن چلا جائے یا حسب خواہش آئے مگر دھیرج وان پُرش اپنے پائے استقلال کو اِنصاف و سچائی کے راستہ سے نہیں ہٹا سکتا۔"

زندگی کے آخری ایّام میں لالہ ہنسراج مہاجن بواسیر جیسے تکلیف دہ مرض کا شکار ہوئے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اپنی جنم بھومی ہمیرپور سِدھڑ میں ہی اُن کی چتا بھی جلائی جائے۔ چنانچہ وہ خود اپنے آبائی گاؤں پہونچ گئے جہاں ۲۷ فروری ۱۹۴۴ء کو آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ اُسوقت آپ کی عُمر ۷۸ برس تھی۔



پروفیسر جے لال کول

"محبت کثرت کے پردوں کو چیر کر ہمیں حق کے رُوبرُو پہنچا دیتی ہے۔ ایک بُلبلہ تک آفاقی اضطراب کے سمندر کو ہوا دے سکتا ہے"۔

"خدا اور بندے کے درمیان کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔ 'وہ' ابد سے ہمیں چاہتا ہے اور سرپٹ دوڑ کر ہمارے پیچھے پڑا ہے، اسلئے وہ ہمیں اپنے سے دُور نہیں ہونے دیگا"۔

ماسٹرجی (مضمون) سے —— •

"ہم سب لوگوں کی یہ خاصیت رہی ہے۔ اُن کی بھی جو اَب ہمارے درمیان نہیں اور اُن کی بھی، جو ابھی زندہ ہیں کہ ہم کہیں بھی جائیں۔ دُنیا کے کسی کونے میں رین بسیرا کریں۔ کشمیر کو ساتھ لے جاتے ہیں اور وہ سب کچھ ہمارے ساتھ رہتا ہے جو اس کی دین ہے"۔

'Home thoughts in spring - 1978 —— •

"لل دید شومت کی پیرو کار تھی مگر اُس میں ہندو عقیدے کی بے تعصبی تھی۔ اِس بات کی اُسکے سامنے کوئی اہمیت نہیں تھی کہ حق کو کسِ

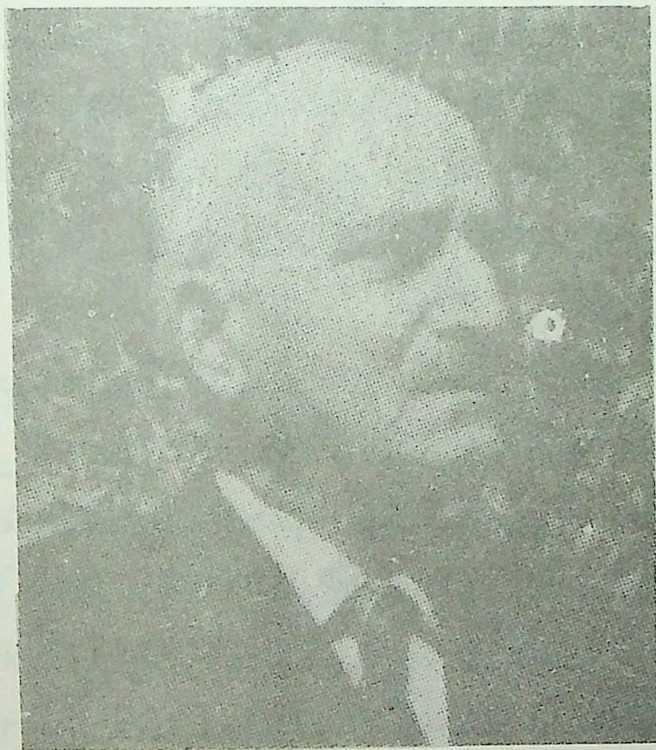
نام سے یاد کیا جاتا ہے، اُس کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے" ۔ Lalded ۔

کول صاحب کو اُن کی تحریروں کے آئینے میں یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ ایک ایسا سنگم تھے جہاں پر مختلف دھارائیں ایک ہو کے رہ گئیں تھیں ۔ وہ نہ تو خالصتاً مغربی طرز کی تقلید کرنے تھے اور نہ ہی تعصب کی حد تک مشرق نواز تھے ۔ اُنہوں نے دونوں کے درمیان ایسا من بھاتا توازن پیدا کیا تھا جو ہر کس اور ناکس کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا تھا ۔ اُن کی پوشاک پر مغربیت کی گہری چھاپ تھی ۔ ٹائی، ہیٹ، کوٹ، پتلون اور ہاتھ میں چھڑی تھامے کول صاحب کو دیکھکر دُور سے لگتا تھا کہ کوئی برطانوی لارڈ کسی غور طلب مسئلے پر اندر ہی اندر سوچتا ہوا سڑک کو ناپتا جا رہا ہے ۔ مگر جب اُن سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو اُن کے اندر کا مشرقی انسان اُچھلکر سامنے آجاتا تھا ۔ مشرق اور مغرب کے درمیان حدود کو سر کرنے والا پروفیسر جے لال کول ایک دِلنواز اور دِلکش شخصیت کا مالک تھا ۔ ایک ایسی شخصیت کا مالک جسے آج کے زمانے میں دِن کے اُجالے میں چراغ جلا کر بھی تلاش نہیں کیا جاسکتا ۔ خاندانی شرافت، نفاست اور رکھ رکھاؤ کے معاملے میں کول صاحب ایک مثالی انسان تھے ۔ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ اُنکا مشفقانہ برتاؤ دیکھنے کیلئے اب آنکھیں ترستی ہیں ۔ بات کرنے کا اُن کا سلجھا ہوا انداز، نرم اور ملائم لہجہ اور دوسرے پر دھونس نہ جمانے کی اُن کی عادت اِن چیزوں کا مُشاہدہ کرنے کے مواقع تو اب خواب ہو کے رہ گئے ہیں ۔

بیسویں صدی بے اندازہ سائنسی و مادّی ترقی اور اقدار و آداب کے زوال کی صدی کے طور پر ایک یادگار صدی رہے گی ۔ عروج و زوال

کی ایسی ہماہمی میں کول صاحب جیسے شائستہ اور باوقار لوگوں کو دیکھ کر یک گونہ طمانیت اور سکون کا احساس ہوتا تھا۔ ترقی کی دوڑ میں شامل رہ کر بھی ان لوگوں نے وہ سب کچھ ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو انھوں نے اپنے بڑے بوڑھوں سے ورثے میں پایا تھا۔ انسانی رشتوں اور روابط کی اعلیٰ قدروں کی قندیل کو روشن رکھ کر ان لوگوں نے مادیت کے اندھیرو ںمیں اُجالے کی فضا کو اپنے اردگرد قائم رکھا تھا۔ اُن کے پاس بیٹھ کر محبت اور شفقت کی اُجلی اُجلی دھوپ میں نہانے کا سماں بندھ جاتا تھا غیریت اور بیگانگی کی دیواریں ٹوٹ کر اپنائیت کی خوشبو سے فضا سرشار ہو جاتی تھی۔ اُن کا اپناپن اور حلیمی کساد بازاری کے اس دور میں ایک دولت گراں سے کم نہیں تھا۔

کول صاحب کے ساتھ میری شناسائی اُسوقت ہوئی جب وہ جوانی کی جولانگاہ سے نکل کر بڑھاپے کی اقلیم میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ شناسائی اُسوقت ایک نووارد بساطِ ادب اور ایک آزمودہ کار قلم کار کے درمیان رفاقت میں بدل گئی جب ہم نے مہینوں ایک ساتھ بیٹھ کر کلیات پرمانند کی پہلی جلد مرتب کرنے کا کام ہاتھ میں لیا۔ قربت کی اس فضا اور رفاقت کے اس ماحول میں رہ کر مجھے اپنے وقت کی اس باعزّت شخصیت کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی اُسکے اندروں میں جھانکنے کا بھی۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ کول صاحب اگرچہ جسمانی طور پر بوڑھے ہو چکے تھے مگر ذہنی طور پر وہ پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد تھے۔ انھوں نے بڑھاپے کو اپنے تازہ کار ذہن پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے کسی بھی موڑ



پروفیسر جے۔ ایل۔ کول

پرا نہیں سِکّہ بند ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ ہر نئی اور اچھّی بات کو اپنانے
کے لئے تیار رہتے تھے اور کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"
اُن کی یہ خاصیت برابر اُس وقت اُن کے ساتھ رہی جب وہ بھگوان کو پیارے
ہو گئے۔ وہ نہ کبھی سٹھیائے اور نہ ہی کچھ لوگوں کیطرح چڑچڑے پن نے
اُن کی شخصیّت کو غیر متوازن بنا دیا۔

کول صاحب نے یورپ کے مرغزاروں سے اپنے لئے فکر و نظر
کا آب و دانہ چُگا تھا مگر وہ مشرق کے عظیم ورثے سے بھی نا آشنا نہیں
تھے۔ ایک سادھک کی حیثیت سے اُنہوں نے کشمیر شومت کا گہرائی اور
گیرائی کے ساتھ مُطالعہ کیا تھا اگرچہ اُنہوں نے کبھی بھی اِس کا ڈھنڈورا
نہیں پیٹا۔ میں نے اِنہیں بارہا شوشاستر کے گرنتھوں کا مُطالعہ کرتے
دیکھا ہے۔ کشمیر شومت سے اُن کی شناسائی کی ایک جھلک لل دید کے
بارے میں لکھی ہوئی اُن کی انگریزی کتاب میں ملتی ہے۔ انگریزی پر اُن کی
دسترس پر بات کرنے والا میں کون ہوتا ہوں، اُنکی انگریزی دانی کا لوہا
تو سارے برصغیر نے مانا تھا اور اُن کی انگریزی تصانیف اس کا سب
سے بڑا ثبوت ہیں۔ اُن کے بارے میں بات کرتے ہوئے پروفیسر ایس۔
ایل۔ پنڈت نے لکھا ہے :۔

*His monumental work on the history
and development of Kashmiri poetry[1]
and his scholarly English rendering of*

---

[1] پروفیسر پنڈت کا اشارہ سٹڈیز اِن کشمیری کیطرف ہے مگر اس کتاب میں شاعری کے علاوہ دوسری اصنافِ ادب کا بھی ذکر ہے۔

the Vakyas (religious-metaphysical utterances) of the fifteenth century Kashmiri woman-mystic saint, Laleshwari, will continue to rank high in the eyes of all keen students of these subjects."

اُردو کے ساتھ بھی کول صاحب کا شغف کافی گہرا تھا اور غالب کے تو وہ شیدائی تھے۔ غالب کیساتھ اُن کی محبت اور اُردو کے ساتھ وابستگی نے انہیں غالب کی شاعری کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی طرف راغب کیا۔ کافی کد و کاوش کے بعد انہوں نے غالب کی شاعری کے کچھ حِصّوں کو انگریزی کا جامہ پہنایا جو بعد میں "Interpretations of Ghalib" کے نام سے شائع ہُوا۔ ادب کے معاملے میں کول صاحب ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے اور جہاں کہیں انہیں فِکر کے گوہر ہاتھ لگتے وہ انہیں سمیٹنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ اُنکے مضامین میں خلیل جبران کے بھی حوالے مِلتے ہیں اور آر شنکر آچاریہ کے بھی، اولیور الٹن کے حوالے بھی اور غالب کے بھی۔ لل دید کے واکھیہ تو بہر حال اُن کے لئے صحیفۂ مُقدّس کا درجہ رکھتے تھے۔

کول صاحب کشمیری شاعری سے بیرونی دُنیا کی فِضاؤں سے آشنا کرانے والے پہلے کشمیری قلمکار تھے۔ اِس اعتبار سے اُنکا وجود کشمیر اور کشمیر سے باہر کی دُنیا کے درمیان ایک ایسا پُل تھا جس سے گزُر کر غیر کشمیری

لے لل دید کا تعلق پندرھویں سے نہیں بلکہ چودھویں صدی کیساتھ تھا۔

اَدب کی جلالی، جمالی اور رُوحانی لذتوں سے آشنا ہو گئے۔ اُنکے اِس احساس کو بھلا دینا اپنے آپ کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہوگا۔ کشمیری کے رسیلے اور سُریلے گیتوں کی گونج نے اُنہیں انگریزی کی وسیع اور بسیط دُنیا سے کھینچ کر اُس وقت مُقامی فضاؤں میں مائلِ پرواز کر دیا جب پڑھے لکھے لوگ کشمیری کا نام سُن کر ماتھے پر بل ڈالتے تھے اور بات کو سُنی اَن سُنی کر کے کوئی اور موضوع چھیڑ دیتے تھے۔ ایسے میں کشمیری زبان اور اَدب کیساتھ اُن کی محبت مالی منفعت کے لئے نہیں تھی بلکہ محض کاروبارِ شوق اور دلی خواہش کی تکمیل اور تشفیٔ قلب کے لئے۔

۱۹۴۵ء میں شائع شدہ اُنکی کتاب 'Kashmiri lyrics' کے پیشِ لفظ میں آپ نے لکھا ہے :-

"میں نے مختصر منظومات کو نغمے کہا ہے کیونکہ یہ منظومات معنوی اعتبار سے نغمے ہیں۔ اِن کو ستار، سارنگی، ڈھول، ساز سنتور اور تمبکھ ناری کی گونج کیساتھ گایا جاتا ہے۔ موسیقی کے یہ آلات ایسے ہیں جنکو ہم نے خاص طور پر کشمیر میں اپنا لیا ہے۔ یہ وہ گیت ہیں جنکو سنگیت کار اور موسیقی کے شیدائی گاتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر گیتوں کے لکھنے والے غیر معروف ہیں۔ یہ گیت موسیقی کے قدیم مسودات میں راگ اور تال کیساتھ فارسی نغمات اور غزلوں کے ساتھ اِدھر اُدھر درج ہیں۔"

کشمیری گیتوں کیساتھ میری محبت کافی گہری اور برحق ہے۔ اِس محبت نے مجھے وادی کے مختلف حصّوں میں گھومنے پھرنے

کی طرف راغب کیا ۔ میری یہ تلاش ۔ نغموں کی بازیابی مسرت
آمیز رہی وہ اس لئے کہ اِن گیتوں میں سے کچھ گیت صرف
دیہات میں زِندہ ہیں۔"

"میں نے موسیقیت اور مٹھاس کیلئے اِن نغمات کو
چاہا ہے وہ اِسلئے کہ کشمیری گیت موسیقی کی چیز ہے۔"

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ فاضل مُصنِّف نے گیتوں
کے انگریزی ترجمے کیساتھ گیت کا کشمیری متن بھی رومن خط میں ہر گیت
کے مقابل میں دیا ہے جسکی بدولت کتاب کی افادیت میں اِضافہ ہوا
ہے۔ یہ کتاب کئی اعتبار سے اب تک حوالے کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔
رومن خط کی بات چلی ہے تو مجھے یاد آیا کہ کشمیری کیلئے رومن رسم الخط
کی تجویز کول صاحب نے ۱۹۴۸ء کی رسم الخط سے متعلق کمیٹی کے سامنے
رکھی تھی مگر وہاں یہ تجویز قبول نہیں ہوئی۔ بعد میں انہوں نے یہی تجویز
۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۵ء کی کمیٹیوں کے سامنے رکھی مگر قبول نہیں ہوئی۔
'Kashmiri lyrics' میں جو رومن طرزِ تحریر کشمیری
کیلئے کول صاحب نے اِستعمال میں لایا ہے اُسکے خدوخال کچھ اسطرح ہیں:

Lal bōh drāyas Lo Lare

CHārāN Lūstum děnkěho rāth

(لل بہ درائیس لولرے ۔ ژھاران لوستم دِین کہو راتھ)

Longingly for love did I, Lalla, setforth;

And many a day and night I searched.

بعد کی کمیٹیوں کے سامنے جو رومن رسم الخط اُنہوں نے رکھا

تھا اُس میں اُنہوں نے کچھ ترمیم اور اضافہ کیا تھا تاکہ کشمیری کی تمام تر ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔[1]

خوش پوش اور خوش گفتار رجے لال کول کھانے پینے کے معاملے میں بھی خاص مذاق کے مالک تھے۔ کھاتے تو کم ہی تھے مگر قہوہ اُن کی کمزوری تھی۔ صبح تڑکے وہ قہوے کی چسکیاں لے کر کام کا آغاز کرتے تھے۔ مہمان موجود ہوں تو اُن کی تواضع لپٹن (چائے) سے کیجاتی تھی اور اسمیں وہ بھی اُن کا ساتھ دیتے تھے مگر قہوے کی چسکیاں لینے سے باز نہیں رہتے۔ کشمیریوں کی خصوصی نمکین چائے "شیر چائے" تو اُن کے گھر چھُٹی کے دِن ہی بنتی تھی۔ یہ چائے پینے میں بھی وہ ضرور شریکِ محفل ہوتے تھے۔ برت اور تہواروں کے موقعہ پر وہ گھر پر بنے ہوئے پکوڑے مزے لے کر کھاتے تھے۔ میں نے میٹھے سیبوں کے پکوڑے پہلی بار اُنکے ہی گھر میں جنم اشٹمی کے دِن کھائے ہیں۔

صُبح کا کچھ وقت وہ گیان دھیان میں صرف کرتے تھے اور خاص تہواروں کے موقع پر برَت بھی رکھتے تھے حالانکہ گرتی ہوئی صحت انہیں اس بات کی اِجازت نہیں دیتی تھی۔ جن دِنوں کی میں بات کر رہا ہوں اُس زمانے میں کول صاحب اپنے ایکسچینج روڈ والے مکان میں بچوّں سے دُور اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ صبح اور شام کو سیر کرنے کے علاوہ وہ دوپہر کو تھوڑی دیر کیلئے سو جاتے تھے اور اپنا اکثر وقت قرینے اور سلیقے سے سجائی ہوئی اپنی لائبریری میں گزُارتے تھے۔ فرُصت کے

---

[1] اِس ضِمن میں مفصّل جانکاری کیلئے دیکھئے میرا مضمُون "کاشُر رسمُ الخط" مطبوُعہ "شیرازہ کشمیری (زبان وادَب نمبر) مطبوُعہ کلچرل اکادمی۔

لمحات میں میں وہ ایس۔ پی۔ کالج کے ایک مُلازم کے دو بچوں کے ساتھ
کھیلنے میں صرف کر دیتے تھے۔ ایس۔ پی۔ کالج کے اُس کشتواڑی مُلازم
کا نام مجھے یاد نہیں، مگر اتنا کچھ یاد ہے کہ اُسے کول صاحب نے اپنے بنگلے
کا ساتھ والا چھوٹا مکان رہنے کیلئے دے رکھا تھا۔ وہ کشتواڑی مُلازم اور
اُسکی بیوی بچے کول صاحب اور اُنکی رفیقۂ حیات کو کافی عزیز تھے۔ مگر
وہ بھی ان دو بوڑھوں کی نگہداشت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے
تھے۔ سرما کا موسم کول صاحب اکثر کشمیر سے باہر بتاتے تھے۔ اُن کی
غیر حاضری میں وہی کشتواڑی ملازم سیاہ وسفید کا مالِک ہوتا تھا اور اگر
کوئی شخص انجانے میں بھی کول صاحب سے ملنے کیلئے وہاں آجاتا تو
اُسے چائے پلائے بغیر رخصت ہونے نہیں دیتا تھا۔ اِس بات کا مجھے
ذاتی تجربہ ہے۔ شاید یہ بات اُس مُلازِم نے کول صاحب سے سیکھی یا
اَپنائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کول صاحب ہر کسی کے ساتھ پیار کا برتاؤ
کرتے تھے۔ اُن کی صحبت میں اِنسان پروانۂ شفقت کے بوجھ تلے
اِس قدر دَب جاتا تھا کہ لگتا تھا کہ زور سے بات کرنے پر خاموش
سمندر میں ارتعاش پیدا ہو جائے گا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ پرمانند کا کلیات مرتب کرنے سے پہلے
میں کول صاحب کو سِرے سے ہی جانتا نہیں تھا۔ ریڈیو کے صلاح کار،
کلچرل اکادمی کے سیکریٹری کی حیثیت سے اور کئی دوسری تقاریب میں
اُن سے مُلاقات ہو ہی جاتی تھی۔ اُنھوں نے ہی پہلی بار مجھے اکادمی
مطبوعات کا پہلا مُفت سیٹ عنایت کیا تھا اور میرے جمع کئے ہوئے
لوک گیتوں کا پہلا مجموعہ بھی اُن کے زمانے میں ہی اکادمی نے شائع کیا

تھا۔ صمدؔ میر کے بارے میں اُن کا لکھا ہُوا مضمون پڑھ کر ہی میرے اندر اس بُلند قامت شاعر کو سمجھنے اور پرکھنے کا خیال پیدا ہُوا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ کُلیات پرمانند کو مرتب کرنے کے دوران ہی اُن ذاتی مراسم کی داغ بیل پڑی جو اُن کی زندگی کے دم واپسیں[۳] تک قائم رہے۔ کبھی کبھی وہ سندیشہ بھیج کر بُلا لیتے تھے اور اگر کشمیر سے باہر ہوتے تو خط لکھ کر یاد دہانی کرتے یا کرواتے تھے۔

۱۹۸۲ء میں "کاشُر سماچار" دہلی نے نادؔم صاحب کے بارے میں ایک خاص نمبر شایع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی ذمہ داری آنجہانی پروفیسر راجن ناتھ رینہؔ کو سپرد کی گئی۔ رینہؔ صاحب ضروری تخلیقات حاصل کرنے کیلئے کول صاحب کے پاس گئے جو اُن دنوں دہلی میں مقیم تھے۔ کول صاحب نے انہیں بتا دیا کہ وہ اس سلسلے میں میرے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ چنانچہ ۲۴، مئی ۱۹۸۲ء کو رینہ صاحب نے کول صاحب کے حوالے سے ایک خط لکھا:-

Dear Moti Lal ji,

Namaskar.

Prof J.L.Koul informs me to request you for the Kashmiri poems of our dear Dina Nath Nadim "Samachar" is to bring out a special number on Nadim era and we have written to all friends for it. You too must have got a request

C/O Shri Pran Kishore of Radio Kashmir.
I am not fit to travel otherwise should have moved to Srinagar. Will you oblige me by sending the poems and home address of Nadim Sahib. I shall deem it a favour. Sure you will oblige me. Santosh ji sends āhi

With all good wishes.

Sincerely your's

R. N. Raina

کول صاحب کو کیا کچھ نظر آیا تھا کہ وہ میری قدر کرتے تھے۔ اِس کا راز مجھے اب تک معلوم نہیں ہوا اور اب ہوگا بھی نہیں مگر میں ضرور اُن کی کرم فرمائی پر نازاں تھا۔ ایک جہاندیدہ بزرگ کی نظرِ کرم تو گنجِ گرانمایہ ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۸۳ء میں کول صاحب کشمیری "لل دید" کا تیسرا ایڈیشن تیار کر رہے تھے۔ وہ اُن دنوں بارہ بنکی میں مقیم تھے اِسلئے ذاتی طور رابطہ قائم ہونا ممکن نہیں تھا۔ ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

Barabanki

15-11-1983

My dear Saki Sahib,

I repeat my request.

Kindly do send me what you promised to send me viz, one or more pages of your notes which would be helpful to me while preparing 'Lal Ded' for the third edition. I very much value your help and assistance. You may also point out any inaccuracies whereever and suggest elucidation and other improvements you deem necessary or helpful. I shall be grateful.

God bless you.

Your's sincerely,

J. L. Koul.

اس میں شک نہیں کہ کول صاحب شان کی زندگی جیئے اور ہر محفل میں ان کی عزّت و توقیر ہوئی ۔ مالی اعتبار سے بھی اُن کو کوئی پریشانی نہیں تھی مگر زندگی کے آخری دور میں اُن کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

رواں صدی کی آٹھویں دہائی میں کول صاحب کی زندگی ایک کے بعد ایک امتحان سے گزری ۔ ایک طرف بڑھاپا اور دوسری طرف جاں لیوا آزمائشیں مگر بوڑھے جسم میں جوان دل رکھنے والے کول صاحب چٹان بن کر آزمائشوں سے نبرد آزما رہے۔ سب سے پہلے وہ رفیقہ حیات کی بیماری کے مکڑی کے جال میں آپھنسے ۔ ہوا یوں

کہ بیماری کے نتیجے میں وہ یاداشت کی ساری قوت کھو بیٹھی اور ساتھ ہی
اُس نے شناساؤں کو پہچاننے کا ملکہ بھی کھو دیا۔ ایک اکیلے کول صاحب
کیساتھ اُسکی یاداشت اور پہچان کا سلسلہ بنا رہا۔ اُن کی غیر حاضری
میں تو وہ پانی تک نہیں لیتی تھی دوا اور غذا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ آزمائش کے اس زبردست موڑ پر کول صاحب نے اپنی تمام تر
توجہ رفیقہ حیات کی تیمارداری پر مرکوز کی۔ صبر اور تحمل کا دامن تھامے
وہ اپنا بیشتر وقت تیمارداری اور بیمار کی نگہداشت پر صرف کرتے تھے۔
سیر کرنے کی عادت کو منسوخ کردیا اور بیرونی دُنیا سے رابطہ تقریباً تقریباً
منقطع کردیا۔ معمولات میں تبدیلی لاکر وہ گھنٹوں چارپائی کے پاس بیٹھے
رہیے۔ وہ برس ہا برس سے کمر درد کے مریض تھے اور درد کی شدت
کو کم کرنے کیلئے وہ بیلٹ باندھے رہتے تھے مگر تیمارداری کے معاملے
میں اُنہوں نے ذاتی دُکھ کو بُھلا کر اپنا فرض، اپنی ذمہ داری بدرجۂ احسن انجام
دی اور کسی بھی وقت اپنے فرائض سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ بالآخر اُنکی رفیقۂ حیات
پرلوک سدھاری۔ ایک آزمائش سے تو وہ سرخرو ہوکر نکلے مگر دوسری
آزمائش دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ کول صاحب کو کئی دِنوں
سے گلے کی تکلیف کی شکایت تھی۔ آخر کار ظاہر ہُوا کہ اُن کو گلے کا کینسر
ہوگیا۔ علاج مُعالجہ ہُوا مگر بے سود۔ نوبت اوپریشن تک آپہنچی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے میٹھی میٹھی باتیں کرنے والا جے لال کول قوت گویائی سے محروم
ہوگیا۔ اپنی اس حالت زار کا حال اُنہوں نے ایک خط میں مجھے پُونا سے لکھا:

پُونا

۲۷، جُولائی ۱۹۸۰ء

عزیزی موتی لال جی۔ نمسکار۔ تُہند ۲۴ جولائی ہُند خط
ووت۔ یہ گوس سیٹھا خوش۔ مُدّن چھُ پننین یارن باین
ہُنْد خط تسلی اوت نہ دِوان ہلِی کہ پننہ پانک عزت تہ کھارُن۔
آہنو یہ تہِ چھُس یارن باین وُڈ آسنہ تہ وُنہ کیا ہتام باسان۔
یہ چھُس تۆرے سیٹھا خوش تہ تہِ تُہند مشکور تہ۔
دُنیا ہس منز چھا کانہہ اکھا ییمِس نہ کُنہ نتہ کُنہ ساعتہ
دُنیا کھ تیتھ چھُ ہاوان۔ وۄنی گو کانسہ زیادہ پہن کانسہ کم۔
یا دُچھن واکس تِی باسان۔
وۄنی چھُس یہ یورے کُنہ پوان۔ از گام ۹۱، دوہ ہیتیا نس
منز وُنہ تہ چھِم نہ ہیکان وُنتہ کرنم ڈِسچارج۔ تمن چھُنہ تقصیر
یہ دود تہ یہ اپریشن اوس تیتھے۔ وۄنی چھُ ساریے زخمن
انگ آمُت۔ وُنہ چھپے مگر شاہ کھسن وسن وتھ۔ یوسہ جراحی
کِنی سر جینو ہٹس تلہ کنہ کڈ ہتر چھپے سو چھے رژھا آمیے راتھ
تہ لگن دۄہ دۄہ دوہ۔
تہند شکریہ بیّیہ کران تہ تعہ یہ آہی کران نِ تندرست
آسو، ہنیچ شانتی آسی تۆ۔ زِیٹھ واکُس تہ میوٹھ بتہ
آسی تۆ۔ چھُس یہ تُہنْد رُت یرژھن وول۔
پروفیسر جیا لال کول

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اِس سے پہلے کے خطوط میں آپ
اپنا نام جے لال کول لکھا کرتا تھے مگر بیماری نے اُن کی یہ ادا بھی
چھین لی تھی۔

مجھے تو کول صاحب کی معلمانہ زندگی کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں مگر پروفیسر ایس۔ ایل۔ پنڈت اس سلسلے میں اُن کے سنگی ساتھی رہے ہیں۔ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے :-

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پروفیسر کول کا نام وہ بیشمار مرد اور عورتیں عزت و احترام سے لیں گے جن کو اُن کے سائے میں پڑھنے لکھنے کا موقع فراہم ہوا۔ اُن میں سے بہت سارے لوگ ابھی ہمارے ساتھ ہیں اور اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اُنہوں نے کسطرح اُن کے دلوں میں انگریزی زبان اور ادب کا ذوق اور جذبہ پیدا کیا۔ اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ادب کا ایک عظیم پروفیسر اس قدر تربیت کی پیداوار نہیں ہوتا جتنا کہ طالب علموں کیساتھ خوبصورتی کے ساتھ قوتِ اظہار سے لیس انسان۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر کول اس فطری دین سے آراستہ تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اپنی طویل پیشہ ورانہ زندگی میں اُسنے اپنے مضمون کے اُستاد کی حیثیت سے قابلِ رشک شہرت حاصل کی۔"

۱۹۴۷ء میں کول صاحب بھی کاونٹر پروپیگنڈا کے اُس شعبے سے وابستہ تھے جس میں اُنکے ساتھ بقول اُنکے صدرالدین مجاہد اور حکیم حبیب اللہ بھی کام کرتے تھے۔ اس دور کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے اُنہوں نے لکھا ہے :-

"مجھے فخر تھا کہ میں نے اکتوبر، نومبر ۱۹۴۷ء کے وہ شاندار دن دیکھے جب عام انسان پلک جھپکنے میں عظمت

کی سرحدوں کو چھو گئے۔ ایسے لوگوں میں بہت کم ایسے تھے
جنہوں نے اُس دَور کی طوفان خیزی سے تاثر حاصل نہیں کیا۔

اپنے معاصرین کیساتھ کول صاحب کے تعلقات کافی اچھے
تھے۔ غلام احمد مہجور نے اپنی ڈایریوں میں کئی بار کول صاحب کا ذکر کیا
ہے اور عبدالاحد آزاد کیساتھ اُن کی باقاعدہ خط و کتابت تھی۔ کول صاحب
کے آزاد کے نام دو خطوط میرے پاس موجود ہیں جن کی تاریخی تناظر
میں خاصی اہمیت ہے اسلئے میں دونوں خطوط من وعن شاملِ مضمون
کرتا ہوں :-

Exchange Road,
Srinagar, Kashmir.
NOV 14, 1946

جناب آزاد صاحب

آداب عرض و پیار۔ مُدت سے آپکے درشن کا شوق
تھا۔ اور چاہتا تھا کہ آپ کو خط لکھوں کہ جب کبھی آپ سرینگر
آجاویں تو ضرور مجھے بھی درشن دیں۔ بلکہ اُمید تھی کہ آپ
خود ہی ایسا کریں گے اور میری دعوت پر نہیں چھوڑینگے۔
میں نے آپ کے دوست پنڈت پریم ناتھ بزاز سے
ایک دو دفعہ جو ملنے کا اتفاق ہُوا آپ کا حال پُوچھا اور
کہا کہ آپ کو ضرور کہیں کہ مجھے بھی ملیں جب کبھی آپ سرینگر
آجائیں۔ غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ میں پچھلے سال (پورا
ایک سال گذرا) میرپور کی پرنسپلی سے امر سنگھ کالج کی

پروفیسری پر تعینات ہوا۔ میں بہت خوش ہُوا۔ قریباً سات آٹھ سال کے لمبے عرصہ کے بعد پھر گھر آنا نصیب ہُوا۔

میری کتاب "کشمیری لِرِک" اس سال چھپ چکی اور آپ کی دو غزلیں بھی اسمیں ہیں۔ میں نے آپکے لیئے ایک کاپی تو ضرور رکھوائی ہے جو کہ RINEMISRAY پبلشرز کے پاس ہے اور مجھے انتہائی خوشی ہوگی جب کہ میں خود وہ کاپی آپ کو پیش کروں۔

میں نے سُنا ہے کہ آپ اب دوسرے رنگ میں بہت کچھ کہتے ہیں۔ میں بہت مشکور ہوں گا اگر آپ براہِ مہربانی کوئی دس بارہ نیئے رنگ کی نظمیں یا اور کوئی آپکی غزلیں جو آپ کو منظور ہوں، مجھے بھیج دیں یا اپنے ساتھ لائیں۔ آپ یہ سُن کر خوش ہونگے کہ کوئی چھ سات پروفیسر اب کشمیری کیطرف دھیان دینے لگے ہیں اور ہم سب ملکر کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مجھے ملتے تو شاید ایک انجمن قائم ہونے کا امکان ہوتا۔ آپ ضرور خط کا جواب دیں اور یہاں آنے کا وعدہ کریں۔ سلام

آپکا صادق

جے لال کول، پروفیسر

C/O Lient P.N. Kak

Senior Veterinary Officer

Jammu. Cantt.

پیارے دوست

آداب۔ مُدت ہوئی جب آپ سے مِلا تھا اور آپ کی مہربانی کی یاد ابھی تر و تازہ ہے۔ ڈاکٹر پدمن ناتھ جی کا اور بھی شکریہ ہے۔ ایک تو انہوں نے اپنی مہربانی کی اور دوسری آپ سے ملایا۔ آپ کہتے ہونگے بھلا آدمی ہے آیا، بیٹھا، کھایا، پیا اور چلا گیا۔ باتیں بہت کیں مگر کبھی یاد بھی نہ کیا۔ کہا تھا ڈائریکٹر صاحب سے متعارف کراوں گا۔ وہ بھی غلط۔

دو مہینے گزرے۔ میں جموں پہنچا اور چارج لے لیا۔ پانچ ہفتے ہی گزرے تھے کہ خبر مِلی بھائی بیمار ہے اور مر بھی گئے۔ سرینگر گیا وہاں کریاکرم کر کے ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ آتے ہی یاد آگیا کہ آپ کی نسبت اور آپکے کام کے متعلق ڈائریکٹر صاحب سے بات چیت کرنی ہے۔ اُن سے مِلا اور آپ کا مفصل طور ذکر کیا۔ اُنہوں نے ایک نوٹ بھی یاداشت کے طور پر رکھا اور جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں آپکی ہمت دیکھ کر خوش بھی ہوئے۔ میں نے عرض کی کہ آپ کا کام بہت مُفید ثابت ہوگا اور ریسرچ کا کام ہے۔ ابھی کچھ وقت اور لگے گا اور آپ نے بہت ہمت اور محنت سے کشمیر بھر کے پُرانے نسخے مہیا کر کے

نقل اُتار رہے ہیں اور شاعروں سے ملاقات کی ہے۔ زبان خاصی اچھی ہے مگر ممکن ہے کہ صحت کی کسی کسی جگہ ضرورت ہو۔ علاوہ آپ کا کام نیا کام ہے اور امداد کا خواستگار ہے۔ محکمہ تعلیم کو چاہیئے کہ آپ کی امداد کرے۔

ڈائریکٹر صاحب نے سب کچھ سُن لیا۔ محکمہ تعلیم میں ویسے کسی قسم کا کوئی فنڈ نہیں ہے البتہ سفارش ہو سکتی ہے، اور پرائم منسٹر سے انعام مل سکتا ہے۔ مگر میں نے کہا جناب چاہیے تو یہ کہ کتاب جب مکمل ہو جائے تو اُس کو چھپانے کی کوئی صورت کی جاوے تاکہ آزاد صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہو اور کسی گئے گزرے معمولی، یا دغا باز چھاپنے والے یا کُتب فروش سے واسطہ نہ پڑے۔ ڈائریکٹر صاحب نے بات سمجھ لی اور امداد کرنے کیلئے مستعدی بھی ہوئے۔

ڈائریکٹر صاحب کل سرینگر چلے گئے ہیں میرے خط کے ملنے کے بعد۔ موقعہ ملے کبھی کسی دن سرینگر جا کر اُن سے ملئے اور میرا ذکر کیجئے اور کہئیے کہ میں نے آپ کو لکھا ہے کہ آپ کی کتاب کے متعلق میں نے ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ ڈائریکٹر صاحب لمبے آدمی ہیں اور ایسی باتوں سے خوش ہوتے ہیں۔ بات اور زبان کے بہت ہی میٹھے ہیں اور بہت نرمی اور آداب سے پیش آئیں گے۔ اُن کا شکریہ ادا کیجئے اور جو سوال پوچھیں گے اُسکا مختصر جواب دیجئے اور اپنی کتاب کی ترتیب اور مصالحہ اور مسودے اور نسخہ جات

کی صداقت مانگ تو سب کچھ کہیئے۔ اپنی کوئی محکمہ کی غرض نہ بتایئے۔ جب تک نہ وہ کوئی سوال کر بیٹھیں، کیونکہ ایسا کہنا موزوں نہ ہوگا۔ خاص کر آپ کے لئے۔

اب میری سُنیئے۔ میرا کام ادھورا پڑا ہے۔ اس سردی کے موسم میں چھپ جائے تو چھپ جائے۔ صاحب کہنے والے جو کہیں لکھنا کارے دارد۔ آپ اس بات کو خوب سمجھ سکتے ہیں گھر کی فکریں ہوں اور دل کا آرام نہ ہو تو بتایئے کیسے لکھ سکتا تھا۔ خیر پرم آتما نے چاہا تو کتاب کسی دن مکمل ہوگی اور آپ بھی خوش ہونگے۔

بہار کے آخیر میں سرینگر آؤں گا اور اب کے جو ہو کشمیری لکھنے والوں اور کہنے والوں کی ایک شاندار مجلس ہو تاکہ سب سمجھیں ہاں کوئی جماعت اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔

میری طرف سے ڈاکٹر پدمن ناتھ جی کو نمسکار اور پیار۔ اُن کی مہربانی اور محبت کا ممنون ہوں۔ ناگام کتنی خوش گوار جگہ ہے اور جموں کتنی ناخوشگوار جگہ ہے۔ دیکھیئے اجل کی بات ہے۔ آدمی تقدیر کا بندہ ہے، کیا کر سکتا ہے۔ آداب

آپکا صادق

جے لال کول

پروفیسر کول کو ادب کا ذوق اپنے پتا لار کول سے ورثے میں ملا تھا جو کشمیری شاعری اور خاص طور پر لل دید اور پرمانند کے

زبردست مدّاح تھے۔ کول صاحب پرمانند مرتب کرنے کے دوران اکثر اپنے والد محترم کا ذکر کرتے تھے۔ اُن ہی کی بدولت اُن کو پرمانند کے کافی اشعار زبانی یاد تھے۔ اپنے والد محترم کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کول صاحب نے انگریزی لل دید میں لکھا ہے :۔

"مجھے اپنے والد کے اس قول سے شروع کرنے کی اجازت دیجئے جسکو کہ وہ اکثر دہرایا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ لل دید کے مستند اور معتبر واکھیوں کی تعداد ساٹھ ہے جو باسکر رازدان کے مجموعے میں درج ہیں۔ اس تعداد میں جو بھی اضافہ ہوا ہے، چاہے وہ چھپی ہوئی صورت میں ہو یا مسودے کی صورت میں، اسے قبول کرنا ہچکچاہٹ سے خالی نہیں۔"

کول صاحب کے مضامین مقامی رسالوں کے علاوہ متعدد بیرون رسالوں میں چھپتے تھے جن میں "P.E.N. Journal" "Vitusta" "شیرازہ" "Koshur samachar" "Indian literature" وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی کتابوں کی تفصیل اسطرح ہے :۔

1945 _ Kashmiri lyrics

(بہ اشتراک آنجہانی نندہ لال کول طالب) 1964 _ لل دید (کشمیری)

1973 _ (English) Lal Ded

1961 _ (") Genius of Tagore

1968 _ Studies in Kashmiri

1964 _ Interpretations of Galib

اور اس کے علاوہ

پرِ چاننِد ۔ جلد ا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (بہ اشتراک موتی لال ساقی)

جینیس آف ٹیگور پر آپ کو ٹیگور صد سالہ تقریبات کمیٹی نے انعام سے نوازا اور STUDIES IN KASHMIRI پر آپ کو ریاستی کلچرل اکادمی کا کتابوں کے مقابلے میں انعام ملا۔ کول صاحب کی انگریزی للّہ دید کے ترجمے ملک کی دوسری کئی علاقائی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں اور اسکا اُردو ترجمہ کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی ہے۔

۱۹۷۴ء میں جشنِ اعزاز کے موقع پر دوسرے سرکردہ لوگوں کے ساتھ پروفیسر کول کو ریاستی کلچرل اکادمی کی فیلوشپ کیلئے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ تقریب ۱۶ فروری ۱۹۷۴ء کو گلاب بھون جموّں میں ہوئی۔ تقریب کے موقع پر پڑھے گئے اعزازیہ (CITATION) کی عبارت یوُں ہے:۔

پروفیسر جے لال کول ۶ نومبر ۱۹۰۰ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ سری پرتاپ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ تحصیل علم کے بعد آپ سری پرتاپ کالج میں ہی انگریزی ادب پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اور اسی دوران کشمیری زبان و ادب کے ساتھ اُن کی دلچسپی کا نتیجہ خیز آغاز ہُوا۔

کشمیری زبان کے جذبہ محبت سے سرشار گیتوں کا KASHMIRI LOVE LYRICS کے نام سے آپ کا

انگریزی میں ترجمہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۴۷ء
میں ریاست میں عوامی حکومت کے قیام کے بعد آپ اُس
سرکاری کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے جس کے ذمہ کشمیری
کے لئے رسم الخط وضع کرنا تھا۔ اس کام کی تکمیل کے بعد
دوسرے عالموں کیساتھ آپ کو بھی انعام سے نوازا گیا۔ ۱۹۴۹ء
میں آپ دستور ساز اسمبلی کی ہندی کمیٹی کے رُکن مقرر ہوئے۔
۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء تک آپ ساہتیہ اکادمی کی ایگزیکیٹو
کمیٹی جنرل کونسل اور کشمیری کیلئے صلاح کار کمیٹی کے ممبر بھی
رہے۔ کچھ عرصہ تک آپ ریڈیو کشمیر سری نگر میں ادبی مشیر
کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں آپ
مرکزی سرکار کیطرف سے اُدیبوں کے ایک خیر سگالی مشن کے
ساتھ سوویت یونین کے دورے پر چلے گئے۔ آپ ریاست
کی کلچرل اکادمی کے سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ آپ کی تصنیفات
کی فہرست بہت طویل ہے جن میں "اسٹیڈیز پیزان کشمیری"
اور "جینیس آف ٹیگور" پر آپ کو ریاست کی کلچرل اکادمی
اور ٹیگور صد سالہ تقریبات سے متعلق کمیٹی کیطرف سے
انعام سے نوازا گیا ہے۔ آپ کی لکھی ہوئی کلامِ غالب
کے انتخاب کی ایک انگریزی تشریح اور تفسیر INTERPRETATIONS
OF GHALIB کے نام سے بھی شایع ہو چکی ہے جسے ادبی
حلقوں میں توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حال ہی میں
ساہتیہ اکادمی دہلی نے "لل دید" پر اُن کا انگریزی کتابچہ

شائع کیا ہے۔ آپ کشمیری لغات کے ادارتی بورڈ کے رکن بھی ہیں"۔

ریکارڈ کی درستی کے لئے یہ کہنا مناسب رہیگا کہ کول صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم بارہمولہ اور سرینگر کے سی۔ ایم۔ ایس سکول میں حاصل کی تھی۔ آپ نے ۱۹۲۲ء میں انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور ۱۹۲۳ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۴۴ء میں کرن سنگھ کالج میرپور کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۴۶ء تک آپ میرپور میں ہی رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک آپ ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن رہے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک آپنے ریڈیو کشمیر کے پروگرام ایڈوایزر کی حیثیت سے کام کیا۔ آپ نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک ریاستی کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔

کول صاحب ۲۹۔ دسمبر ۱۹۸۶ء کو سورگباش ہوئے اور اسی دن اُن کے جسد خاکی کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ریاستی کلچرل اکادمی اور ایس۔ پی کالج کی ماتمی قرار دادوں کے ساتھ ہی اُن کی خدمات کے اعتراف کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہمارے یہاں کافی دنوں سے یہ ریت چلی آرہی ہے کہ جو گیا سو گیا اب یاد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور کول صاحب کے بارے میں بھی اس ریت کو اپنایا گیا۔ خیر لوگ دہرانے یا یاد کرنے سے دوام تو نہیں پاتے۔ اُن کا کام ہی اُن کے دوام کا ضامن ہوتا ہے۔

وفات سے کچھ وقت پہلے ایک دن غالباً ستمبر کے مہینے میں اتفاقاً اُن سے ملنے گیا۔ بات تو وہ کر نہیں پاتے۔ اپنی اسٹیڈی

میں بیٹھے تھے اور ساتھ میں محمد یٰسین بچھ بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا" کول صاحب آپ اس بار باہر جا رہے ہیں نا" انہوں نے پہلے اشاروں میں کچھ کہا، گلے سے آواز بھی نکالی مگر میں سمجھ نہیں پایا۔ آخر انہوں نے ایک پرچے پر لکھ دیا" نہیں اس سال میں یہیں ہوں گا"۔ آخر کار وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اُسی مٹی میں جذب ہو گئے جس مٹی سے اُنہوں نے جی جان سے پیار کیا تھا—•



مولوی محمد ابراہیم

پیر محمد افضل مخدومی

انسان رحمت حق ہو جاتا ہے مگر اس کے متعلق چند یادیں باقی رہتی ہیں جو اُس کیلئے ابدی زندگی کا باعث ہوتی ہیں۔ ایسے ہی ایک بزرگ پیر محمد افضل مخدومی مرحوم بھی تھے۔ آپ کا انتقال حالی ہی میں ہوا ہے۔ نام کے ساتھ مخدومی کی نسبت اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ سلطان العارفین حضرت شیخ مخدوم کشمیری علیہ الرحمۃ متوفی ۲۸، صفر المظفر ۹۸۴ھ (منگل، ۲۳، مئی ۱۵۷۶ء) کے خانوادہ سے تھے۔ مخدومیوں کے متعلق مرحوم منشی محمد الدین فوق "اقوام کشمیر" کے صفحات ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱ پر رقمطراز ہیں کہ:

"کشمیر کے مخدومی تین طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو حضرت مخدوم شیخ حمزہ سلطان العارفینؒ کے بھائی بابا علی رینہ کی ذریات سے ہے، دوسرا طبقہ وہ ہے جو حضرت مخدوم صاحبؒ کا ارادت مند و معتقد چلا آتا ہے۔ تیسرا طبقہ محلہ کلاشپورہ میں رہتا ہے۔"

ان میں سے پیر محمد افضل مخدومی کا تعلق مخدومیوں کے طبقہ اوّل سے تھا۔ گوت

یا ذات کے اعتبار سے طبقۂ اول کے محدومی یعنی وہ جو بابا علی رینہ کی اولاد سے ہیں، رینہ ہیں۔ اور رینہ راجپوتوں کی ایک ذات ہے۔ اسی سے یہ لوگ کشمیر میں اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔

پیر محمد افضل مخدومی موجودہ صدی کے پہلے چوتھائی حصے میں بمقام ذری بل سرینگر کشمیر پیدا ہوئے۔ اُن کا صحیح یوم ولادت معلوم نہ ہوسکا۔ کشمیر میں چونکہ بیسویں صدی عیسوی کا آغاز نئی اور پرانی تہذیب کے سنگم کا تھا، تاہم پرانی اقدار قلوب پر ابھی تک حاوی تھیں اور پرانی تہذیب کے خوگر شرفا نئی تہذیب کی جانب پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے اس لیے آپ کی تعلیم بھی قدیم انداز پر عربی و فارسی میں ہوئی۔ اور اُردو چونکہ کوئی نیا اور اہم علم نہیں ہے اس لئے ان دونوں زبانوں کے جان لینے سے آخرالذکر زبان نہ صرف آگئی بلکہ اس میں صاحب قلم انشا پرداز بھی ہوئے۔ یہ تو تحقیق نہ ہوسکا کہ عربی و فارسی میں آپ کے اساتذہ کون لوگ تھے، تاہم آپ نے اُس دور کی مروجہ اور داخلِ نصاب فارسی کتب کریما، نامِ حق، پندنامہ شیخ فریدالدین عطار، منطق الطیر، گلستان، بوستاں، پنج گنج نظامی، مثنوی یوسف زلیخا، مثنوی مولانائے روم، پنج رقعہ اور انشائے خلیفہ اور انشائے مادھورام وغیرہ درساً پڑھی تھیں۔ البتہ عربی زبان اور ادب میں مرحوم کا علم واجبی تھا، تاہم ایسا ہونے کے باوجود بھی بڑے بڑے جگادری اور نامی علماء سے دینی مسائل بہت اچھے جانتے تھے۔

قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ راقم الحروف نے پیر صاحب مرحوم کو بارہا لوہ ٹھہ سے خانیار کو جانے والی سڑک پر دیکھا ہے۔ تاہم بدقسمتی سمجھئے کہ مرحوم سے شرف گفتگو حاصل نہ ہوسکا۔ پیر صاحب مرحوم ایک بلند و بالا، قد آور، ضخیم اور بھرپور جسم کے مالک تھے۔ آپ کی شخصیت سے رعب اور وقار ٹپکتا تھا۔ اکثر سفید قمیض اور شلوار

یں جس کو کشمیر کے موجودہ محاورے میں حالہ ذینس کہتے ہیں، ملبوس رہا کرتے
تھے۔ چال میں آہستگی اور وقار تھا۔ گو کہ عام پیروں کے برخلاف گو داڑھی تقریباً صفا چٹ
تھی، مگر بایں ہمہ چہرہ سے بزرگی اور تمکنت کا وقار ٹپکتا تھا۔ ناک ستواں آنکھیں
کالی بڑی بڑی، پلکیں لمبی، بھویں گھنی ۔۔ یہ ناک و نقشہ اس کا غماز تھا کہ ۔۔
"کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"۔ بقول منشی احمد شاہ صاحب ساکن بابہ جھی
دروازہ مخدوم صاحب پیر محمد افضل مخدومی عرصہ دراز تک آستانِ مخدوم حمزہؒ کے
سجادہ نشین اور پیر طریقت تھے جو تلقین روحانیت کو فیض سے فیضیاب کیا کرتے
تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ کا رجحان اپنے وقت کی سیاست سے بھی تھا۔
آپ کی نگارشات کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ سیاسی امور میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ
کی بنا کردہ نیشنل کانفرنس کے حامی تھے تاہم اس معاملہ میں اُن کا رویہ معتدلانہ
تھا۔ چونکہ مرحوم پیر صاحب قوم پرست تھے اور ہر معاملہ میں بلا اختلاف مذہب
اہلِ کشمیر کی سُرخروئی اور سربلندی دیکھنا چاہتے تھے اس لئے اس معاملہ میں وہ مولانا محمد
سعید مسعودی، مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق، بخشی غلام محمد اور شیخ محمد عبداللہ
کے ہم نوا تھے۔

پیر محمد افضل مخدومی صاحب مرحوم ایک قوم پرست کشمیری اور محب وطن کی طرح
صحیح معنوں میں مجاہد آزادی تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۳۱ء کی توہین قرآن کی تحریک میں
بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اسی طرح سنہ ۱۹۴۶ء کی کشمیر چھوڑ دو کی تحریک میں، جو اُس
وقت کے نیشنل کانفرنس کے زعیم مرحوم شیخ محمد عبداللہ، مولوی محمد سعید مسعودی، خواجہ
غلام محمد صادق اور محی الدین قرہ وغیرہ نے مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف شروع کی تھی،
پیر صاحب بھی زور و شور سے اس میں شریک تھے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت
کی تھیں۔

دیا.......... اسی بزرگ نے مولانا مولوی یوسف شاہ صاحب کو اعتماد میں لے کر نصیحت کی تھی کہ اب زمانہ بدل رہا ہے۔ حالات نے کروٹ لی ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے رہیں، سیاسی معاملات کو نوجوانوں پہ چھوڑ دیں۔ اگر مذہب اور سیاست کو یکجا چلانے کی کوشش کی گئی تو اس سے بے شمار نقائص پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ آپ جس منصب پر براجمان ہیں وہاں تقدس و احترام لازم و ملزوم ہیں۔ اگر سیاست میں الجھا گیا تو یقیناً یہ احترام ختم ہوگا۔"

بالعموم پیر محمد افضل مخدومی کو بحیثیت ایک کاتب یا خوش نویس کے خیال کیا جاتا ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر آپ ایک تخلیقی ادیب اور مؤرخ بھی تھے۔ مرحوم شمیم احمد شمیم ایک بڑھتے ہوئے ہونہار اور جوشیلے نوجوان تھے اور صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سحر البیان اور پُر جوش مقرر بھی۔ راقم الحروف کے بہترین شناساؤں میں سے تھے۔ افسوس کہ شمیم احمد شمیم کی صورت و شمائل میں یہ شعلہ چمکتے ہی خاموش ہوگیا۔ بہر کیف شمیم مرحوم آتش بیان مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور صحافی بھی تھے۔ انہوں نے کشمیر کے دل یعنی شہر سری نگر میں جو ادبی، سماجی اور علمی تمام تحریکوں کا مرکز ہے، ہفتہ وار اردو اخبار "آئینہ" جاری کیا تھا۔ پیر صاحب مرحوم اسی اخبار میں پیر محمد افضل مخدومی خانیاری کے نام سے "تاریخ تحریک حریت کشمیر"* کے عنوان سے قسط وار کشمیر میں بیسویں صدی عیسوی کے سیاسی آثار چڑھاؤ پر اپنے تاریخی مضامین بغرض اشاعت دیا کرتے تھے۔ یہ تاریخ

---

* مرحوم پیر صاحب نے اس ضمن میں خود بتایا تھا کہ وہ ایام جوانی سے ہی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ اس لیے نسبی اہم واقعات انہوں نے قلم بند کر لیے تھے۔ (ادارہ)

کشمیر کی قدیم تہذیب کے نمونہ ہونے کے پیش نظر اور اس وجہ سے بھی کہ کشمیر کے ایسے خانوادہ سے تعلق کے ناتے جس کا کشمیر کی روحانی و مذہبی زندگی سے تعلق رہا ہے، مرحوم کشمیر کے حقیقی اہل علم و فضل کے زبردست قدردان اور معتقد تھے۔ اس سلسلے میں مولانا حسین شاہ صاحب وفائی خانیاری کا، جن کا انتقال پُر ملال جون ۱۹۲۴ء میں ہوا، نام لیا جا سکتا ہے۔ پیر محمد افضل مخدومی مولانا کے مذہبی تقدس اور ان کی علمی بصیرت کے زبردست قائل تھے۔ علماء کے متعلق پیر صاحب مرحوم کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ علماء صرف مذہبی فرائض انجام دیں اور سیاست صرف نوجوانوں پر چھوڑ دیں۔ پیر صاحب کو بلاشبہ کشمیر کے خاندانِ میرواعظ سے اس کی دیرینہ مذہبی خدمات کے باعث لگاؤ ضرور تھا اور وہ اس خاندان کے علماء میرواعظان کا نام پورے ادب و احترام سے لیتے تھے۔ تاہم اسی کے ساتھ اس بات کے بھی قائل تھے کہ یہ خاندان سیاست سے کنارہ کش رہے۔ اس موقف میں پیر صاحب مولوی حسن صاحب وفائی کے ہمنوا تھے۔ "تاریخ تحریکِ حریت کشمیر" قسط نمبر ۲۳ میں جو اخبار "آئینہ" سری نگر میں شائع ہوئی ہے، مولانا وفائی مرحوم کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"میرواعظ خاندان کے بزرگ استاد اور عالم و فاضل شیخ الحدیث حضرت علامہ مولانا حسین شاہ صاحب وفائی خانیاری مجتہد عصر مانے جاتے تھے۔ مولانا مولوی احمد اللہ میرواعظِ کشمیر، مولوی عتیق اللہ صاحب ان کی علمی فضیلت کو مدِنظر رکھتے ہوئے، انہیں آخون صاحب کہتے تھے۔ جب مولانا احمد اللہ انتقال کر گئے تو انہیں اسلامیہ ہائی اسکول کے صحن میں دفن کیا جانے لگا تھا، مگر اکیلے حضرت علامہ مولانا حسین شاہ صاحب نے اس کی مخالفت کی اور شرعاً اسے ناجائز قرار

دیا .... اسی بزرگ نے مولانا مولوی یوسف شاہ صاحب کو
اعتماد میں لے کر نصیحت کی تھی کہ اب زمانہ بدل رہا ہے۔ حالات
نے کروٹ لی ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے مذہبی فرائض انجام
دیتے رہیں، سیاسی معاملات کو نوجوانوں پر چھوڑ دیں۔ اگر مذہب
اور سیاست کو یکجا چلانے کی کوشش کی گئی تو اس سے بے شمار
نقائص پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ آپ جس منصب پر براجمان ہیں،
یہاں تقدیس و احترام لازم و ملزوم ہیں۔ اگر سیاست میں اُلجھا گیا،
تو یقیناً یہ احترام ختم ہوگا۔"

بالعموم پیر محمد افضل مخدومی کو بحیثیت ایک کاتب یا خوش نویس کے خیال کیا
جاتا ہے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر آپ ایک تخلیقی ادیب اور مؤرخ بھی تھے۔ مرحوم
شمیم احمد شمیم ایک بڑھتے ہوئے ہونہار اور جوشیلے نوجوان تھے اور صاحب قلم
ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سحرالبیان اور پُرجوش مقرر بھی۔ راقم الحروف کے بہترین
شناساؤں میں سے تھے۔ افسوس کہ شمیم احمد شمیم کی صورت و شمائل میں یہ شعلہ
چمکتے ہی خاموش ہوگیا۔ بہرکیف شمیم مرحوم آتش بیان مُقرر ہونے کے ساتھ ساتھ
ادیب اور صحافی بھی تھے۔ انہوں نے کشمیر کے دل یعنی شہر سری نگر میں جو ادبی،
سماجی اور علمی تمام تحریکوں کا مرکز ہے، ہفتہ وار اردو اخبار "آئینہ" جاری کیا
تھا۔ پیر صاحب مرحوم اسی اخبار میں پیر محمد افضل مخدومی خانیاری کے نام سے
"تاریخ تحریک حُریت کشمیر"[1] کے عنوان سے قسط وار کشمیر میں بیسویں صدی عیسوی
کے سیاسی اُتار چڑھاؤ پر اپنے تاریخی مضامین بغرض اشاعت دیا کرتے تھے۔ یہ تاریخ

---

[1] مرحوم پیر صاحب نے اس ضمن میں خود بتایا تھا کہ وہ ایام جوانی سے ہی ڈائری لکھا کرتے
تھے۔ اس لیے زیادہ تر سبھی اہم واقعات انہوں نے قلم بند کر لیے تھے۔ (ادارہ)

نویسی اُس وقت معرض تحریر میں آنے لگی تھی جب مرحوم شیخ صاحب کی "آتش
چنار" کا غالباً خاکہ بھی تیار نہ ہوا تھا' اور اس بنا پر کشمیر کی سیاسی و سماجی
تاریخ کی تحریر کے سلسلے میں مرحوم پیر محمد افضل مخدومی کو تاریخی نقیب اور پیشرو کا
مرتبہ حاصل ہے۔ تاریخ کے اس سلسلہ کی ۲۲۳ ویں قسط راقم الحروف کے پیش
نظر ہے جو راقم کے ث گرد رشید مولوی وحافظ عبدالرحمان صاحب وفائی
فرزند ارجمند مذکرہ صدر مولانا حسین شاہ صاحب وفائی مرحوم نے مہیا کی ہے۔
اس قسط سے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران کشمیر میں ہونے والے سیاسی خلفشار
اور واقعات سے پردہ اٹھتا ہے اور اصلی کیفیت اور کشمیر میں اُس وقت کی
صورت حال آئینہ کی طرح جلوہ گر ہوکر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس قسط
کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کی بعض سرکردہ شخصیتیں خاندان میرواعظ
کی سیاست میں شرکت کو بنظر استحسان نہیں دیکھتی تھیں۔ احمدیوں کے خلاف
زبردست جوش و خروش تھا۔ بلکہ بعض کے خیال میں مرتد توہین قرآن کا موجد
عبدالقدیر بھی دراصل مرزائی تھا۔ اس سے لوگ عجیب حیرت اور مخمصے میں پھنس گئے
تھے اور کہہ رہے تھے کہ یا اللہ کیا ماجرا ہے ۔ ابھی تحریک شروع بھی نہیں ہوئی کہ
مسلمانوں میں افتراق و انتشار رونما ہونے لگا ہے۔ بقول شخصے "سر منڈاتے
ہی اولے پڑے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۳ نومبر ۱۹۳۱ء میں جموں میں گولی چلی تھی جس سے پانچ
مسلمان شہید ہوگئے تھے۔ اس موقعہ پر شیخ صاحب اور مولوی یوسف صاحب
جموں گئے تھے تاکہ جموی مسلمانوں کی حالت زار کا بچشم خود معائنہ کریں۔ جموں سے
مراجعت پر مولانا محمد یوسف شاہ صاحب نے سرینگر کی جامع مسجد میں ایک مجلس وعظ
کے دوران کہا تھا کہ ۲۷ ہزار احراری رضاکار ہماری جدوجہد آزادی کی قید میں پڑے

ہیں۔ میں نے غلطی سے "کشمیر کمیٹی" کو تعاون دیا ہے" یہ مرزائیوں کی جماعت ہے۔

علاوہ مورخ کشمیر ہونے مرحوم پیر محمد افضل مخدومی ایک بے لاگ مقالہ نگار بھی تھے۔ آپ کا تعلق حالانکہ کشمیر کے پیر خاندان سے تھا، اور ساتھ ہی سلسلۂ سہروردیہ کے سجادہ نشین تھے جو سلطان العارفین حضرت شیخ مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمتہ کا اپنا سلسلہ تھا۔ تاہم اس کے باوجود ان باباؤں اور مجاوروں کے شدید نکتہ چین تھے جنہوں نے جعلی سندات کے ذریعہ گذشتہ زمانے میں لکھی گئی جعلی سندات کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک مقالہ غالباً ۱۹۷۰ء کے ابتدائی مہینوں میں "آفتاب" سرینگر میں شائع ہوا تھا۔ اس سے راقم کا ذہن معاً ۱۹۵۲ء و ۱۹۵۳ء کے اُن ایام کی طرف لوٹ جاتا ہے جب راقم محکمہ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن سرینگر، کشمیر میں صاحبزادہ پروفیسر حسن شاہ صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریسرچ اینڈ پبلی کیشن کے ماتحت بحیثیت ہیڈ مولوی (عربی و فارسی ریسرچ اسسٹنٹ) مصروف کار تھا۔ اُن دنوں بہت سی اسناد جن کا تعلق بعض آستانوں کے مجاوروں کے نام مستقل طور پر جاگیروں کے دائمی وقف سے تھا، برائے فروخت محکمہ کو موصول ہوا کرتی تھیں۔ ان کے مطالعہ سے راقم اور صاحبزادہ حسن شاہ صاحب بالعموم اس نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ ان اسناد کا بیشتر حصہ جعلی ہے۔ ہونے پر سہاگہ یہ کہ بعض اسناد پر شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی مہریں ثبت ہوتی تھیں۔ ان دستاویزات کا تعلق بالعموم ایک شخص نبیرۂ شیخ قاسم سے ہوتا تھا۔

اپنے سیاسی رفقاء میں سے دو کے بارے میں ان کے مضامین شیرازہ (اُردو) جلد ۱۲، شمارہ ۲، ۳ (صادق نمبر) میں چھپے ہیں۔ ملاحظہ ہوں دو اقتباس:۔
غلام محمد صادق کے بارے میں اپنے مضمون " خوش گفتار، خوش کردار" میں

یوں رقمطراز ہیں :۔

"..... صادق صاحب جس طرح طبعاً شریف اور کفایت شعار تھے اسی طرح سیاسی میدانِ کارزار میں عمل پیرا رہے ۔ وہ ہمیشہ نعرہ بازی، ستیہ گرہ، جلسے جلوسوں اور دنگے فسادوں کے خلاف تھے وہ ہمیشہ اُن ہی مجالس اور جلسوں میں شامل ہوتے تھے جہاں انہیں سکون اور اطمینان کا یقین ہوتا ۔ اگر ان کے عملی کردار کا محاسبہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں نسبتاً بہت کم حصّہ لیا ہے ۔ صرف ایک بار نیشنل ڈیفنس رولز کی پاداش میں چھ مہینے جیل گئے تھے ۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ شیخ صاحب ذاتی طور ان کی عزت و قدر کرتے تھے ۔ اسی لئے کئی اہم کام ان کی تحویل میں دیئے جاتے تھے جس سے صادق صاحب کی وقعت بڑھی اور شخصی وقار قائم ہوا ۔ جس طرح مولانا مسعودی، محی الدین قرہ اور بخشی غلام محمد وغیرہ رات دن مجاہد منزل میں تحریکِ حریتِ کشمیر کو فروغ دینے کے لئے سرگرم عمل رہے ۔ صادق صاحب مقابلتاً عافیت کوش تھے ...... وہ ہمیشہ خوش پوش اور خوش باش تھے ۔ ان کی ٹائی اور کالر میں کبھی بھی شکن نظر نہ آتی ۔ کسی کو سگریٹ پیش کرتے یا چائے وغیرہ کی دعوت دیتے نہیں دیکھا ۔ سری نگر میں جو شیر بکرا کے فسادات ہو رہے تھے ان کو بے حد ناپسند کرتے اور فرماتے تھے کہ آخر کب تک ہمیں اس بلا میں گرفتار رہنا ہے ۔ تحریک کا اصل مقصد اس سے فوت ہوتا ہے ۔ مگر اس کے باوجود پارٹی اسپرٹ کا یہ حال تھا کہ جب مولوی یوسف شاہ صاحب

میرزا عظم مرحوم کو سنہ ۱۹۳۷ء میں عرس چار یار کی تقریب پر آثار شریف حضرت بل میں وعظ خوانی کی بندش کی گئی۔ اس جھگڑے میں صادق صاحب بھی با دل ناخواستہ شامل ہوئے اور اپنے پالوش سے بہت سے سامعین کی تواضع کرتے رہے۔ اس معرکہ جنگ و جدال میں بھی اپنی وضع قطع قائم رکھی۔ وقت پر کھانا کھایا، چائے پی اور لباس معمول کے مطابق رہا۔"

"بخشی غلام محمد۔ خاکی و نوری نہاد" کے عنوان سے اپنے ہم جماعت اور ساتھی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :۔

"........ اُن دنوں "بچہ نغمہ" کا فن عموماً بھانڈوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ "کمال بچہ"... "مختہ بچہ" وغیرہ زیادہ مشہور تھے۔ یہ علاقہ وار اور شہر خاص اور قصبہ جات میں جا کر خوب دھن سمیٹ رہے تھے۔ ایسی ہی ایک پُر کیف مجلس میں یکایک شور و غوغا بلند ہوا۔ ڈنڈے چلے ...... ایک دوسرے پر سر مارے جانے لگے۔ کہیں سے خون بہنے لگا، کہیں چادر اور کہیں لوئی چھینی جا رہی تھی۔ سب ایک دوسرے سے اس "جنگی ماحول" کے متعلق استفسار کر رہے تھے۔ آخر کھوج کر کے اتنا معلوم ہوا کہ قادر خان (مرحوم بخشی غلام محمد کے ماموں جان) کی طرف "کمال بچہ" ذرا زیادہ التفات کر رہے تھے۔

قادر خان چشمک کا نشانہ بن گئے مگر انہوں نے اپنے قوّت بازو اور جبروت سے دشمنوں کی اس یلغار کو نہ صرف روکا بلکہ جوابی حملے بھی کئے۔ ان کا ساتھ چند ہم مشرب اور ایک نونہال بھی دے رہے تھے۔

اور یہ نونہال جناب بخشی غلام محمد مرحوم تھے۔ چونکہ تقریباً میں بھی اُن کا ہم عمر تھا اس لئے "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز" میں نے اس بانکے کو گلے لگایا تاکہ اس پر مزید کوئی افتاد نہ پڑے۔ میرے چاچا صاحب بھی قادر خان تماشن کے بزرگ تھے اور ہاتھ پھیر مارنے کے خوب ماہر تھے۔ قبلہ چاچا صاحب غلام قادر خان کی طرح "سُلہ ھولہ" کے نام سے مشہور تھے۔ ایک مشاہدہ کے مطابق سر کی قوت سے پختہ اینٹ کے دو ٹکڑے فرماتے تھے ۔ بہر حال اسی عجیب کشمکش اور جنگ و جدال کی محفل میں بخشی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات بڑھتے بڑھتے کلاس روم سے لے کر عمر کے آخری مرحلہ تک دوستی اور راز و نیاز تک جاری رہی ۔ ہمیشہ دوست رہے اور رقابت و حسد سے دور ۔ البتہ رشک ہمیشہ غالب رہا۔"

میں نے اُن کی تحریروں سے اقتباسات یہاں پر اس لئے پیش کئے تاکہ قارئین کرام اُن کے کھرے پن، صاف گوئی اور انداز و اسلوب کا کچھ کچھ اندازہ لگا سکیں۔

راقم الحروف نے ریسرچ اینڈ پبلیکیشن سرینگر، کشمیر کی ملازمت کے دوران ۱۹۵۳ء میں "خوش نویسانِ کشمیر" کا ایک مفصل تذکرہ بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب یہ تذکرہ راقم نے جناب علی جواد زیدی کو دکھایا جو ریاست کی کلچرل اکادمی کے سیکریٹری تھے، تو اس جدید کوشش پر مع جناب محمد یوسف ٹینگ کے، جو اُن دنوں اکادمی کے اردو رسالہ "شیرازہ" کے ایڈیٹر تھے، موصوف بہت خوش ہوئے۔ راقم نے اس تذکرہ "خوشنویسان" میں صفحہ ۲۴ پر جو بحالت مخطوطہ (مسودہ) ہے، مرحوم پیر محمد افضل مخدومی کا نام ان الفاظ میں لیا ہے:۔

"(پیر) محمد افضل مخدومی دورِ حاضر کے نامور کاتب اور خوش نویس ہیں۔ منشی محمد الدین فوق تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم صفحہ ۷۵، ۷۶ پر پیر محمد افضل مخدومی کے زبردست مدّاح ہیں"۔

مرحوم پیر صاحب کے اپنے بیان[1] کے مطابق خوش نویسی کا فن اُنھوں نے اپنے خُسر محمد سیف الدین پنڈت کے علاوہ محمد سعید قاری خانیاری مرحوم، قاضی عزیز الدین عاشق[2] کشمیری مرحوم اور منشی محمد حسن جموی مرحوم سے لیا تھا۔ بقول مرحوم پیر صاحب یہ تمام بزرگ اس فن کے شہسوار تھے اور ان چاروں سے راقم کو فخرِ شاگردی حاصل ہے۔ اپنے خُسر یعنی محمد سیف الدین پنڈت کے متعلق رقمطراز ہیں کہ آپ خطِ نستعلیق کے پختہ صاحب قلم اور خطّاط تھے۔ قاضی عزیز الدین کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ کی مساعی سے جامع مسجد سرینگر کی محراب پر اسماءِ حسنیٰ بخطِ جلی لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا بیان بغرضِ معلومات ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:-

"آج سے تقریباً چالیس سال قبل (یعنی ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء میں) جب

---

[1] ملاحظہ ہو دو ماہی[2] "شیرازہ" سرینگر، جلد ۱۳، شمارہ ۱، ۲، ۳ صفحہ ۶۳۔ اس سلسلہ میں آپ کا بیان یوں ہے:

"ان ہی یعنی آپ کے خُسر محمد سیف الدین پنڈت کے دور میں محمد سعید قاری خانیاری مرحوم، قاضی عزیز الدین عاشق کشمیری مرحوم، منشی محمد حسن مرحوم اس فن کے شہسوار تھے۔ راقم الحروف کو ان سب کا شاگرد رہنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

[2] قاضی عزیز الدین عاشق کشمیری خواجہ میرم بزاز مرید سلطان العارفین حضرت مخدوم حمزہ کشمیریؒ کی ذرّیت سے تھے۔ عاشق تخلص تھا۔ فارسی شاعری میں ایک غزل آپ سے یادگار ہے۔ قاضی نظام الدین خانیاری ساکن کوٹھی پورہ سرینگر کے قلم سے تحریر اس کی ایک نقل محکمۂ تحقیق و اشاعت حکومت جموں و کشمیر، سرینگر کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔

جامع مسجد سرینگر مسٹر الوری کی نگرانی میں تعمیر ہو رہی تھی تو آخری مرحلہ میں مسجد کو منقش کرنے کا وقت آیا۔ تنظیمی بورڈ نے یہ فیصلہ لیا کہ مسجد کی محراب میں اسماء الحسنیٰ اور سورۂ جمعہ خطِ نسخ (طغریٰ) میں لکھ کر سنگ تراشی کرائی جائے۔ میرٹھ یوپی سے مشہور خطاط نسخ اور طغریٰ نویس حافظ محمد اسحاق جمیل رقم کو سرینگر بلایا گیا۔ ریش دراز اور نورانی شبیہہ کے بزرگ تھے۔ کئی ہفتے طغریٰ اور نسخ میں مشق کرتے رہے۔ اسماء الحسنیٰ تو مکمل کر لئے مگر سورۂ جمعہ محراب کے دائرہ میں برابر نہ رہا۔ کبھی ایک سنگ کا اضافہ ہوتا تھا اور کبھی کمی رہتی تھی۔ محترم جمیل رقم بھی عاجز تھے اور الیوری صاحب بھی مایوس ہوئے۔ ساتھ ہی اخراجات کا بوجھ گراں ہو رہا تھا۔ راقم کے بزرگ اور استاد قاضی عزیز الدین صاحب مرحوم مغفور کو مسٹر الیوری کے ساتھ کچھ شناسائی تھی۔ ایک دفعہ صاحب بہادر نے مسجد کے اندر قاضی صاحب کو بلا کر شکایت کی کہ محراب کے مکمل کرنے میں جلدی ہے مگر آیاتِ قرآنی لکھنے میں وقت آ رہی ہے اور رقم ضائع ہو رہا ہے۔ مرحوم قاضی صاحب نے جو بے حد ذہین، عالم فاضل اور باثروت شخصیت کے حامل تھے مسٹر الیوری کو یقین دلایا کہ یہ سب کام تین دن کے اندر مکمل کر کے دے دوں گا۔ مسٹر الیوری پہلے تو ہنسی مذاق میں ٹالنے لگے لیکن انہیں جب یہ ذہن نشین ہوا کہ جب یہ سب کام قاضی صاحب جیسا سنجیدہ اور متین انسان ذمہ لیتا ہے تو ضرور انجام دے گا۔ چنانچہ باوجود ذاتی مصروفیات کے یہ سب خطاطی ایک ہفتہ میں مکمل ہوئی اور استاد سنگتراش شدومد

اور اعراب کشی میں قطعاً دقت محسوس نہ کرپائے اور اسماء الحسنیٰ اور
سورۂ جمعہ کے یہ نادر کتبے جو قاضی مرحوم کی فنِ خطاطی کا نمونہ ہیں،
ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ قاضی عزیز الدین عاشق کشمیری جو فنِ خطاطی
میں ماہر تھے لیکن یہ فن اُن کا ذریعہ معاش نہ تھا بلکہ کشمیر کے علمی
خاندانوں کی روایت میں خطاطی اور خوش نویسی لازم و ملزوم اور
اس کو آبائی ورثہ سمجھتے تھے۔"

ریاستی کلچرل اکیڈیمی ۱۹۵۸ء سے اپنے قیام کی ابتداء سے ریاست جموں و کشمیر کے قدیم علوم و فنون اور اس کی تہذیب و ثقافت کے احیاء میں کوشاں ہے۔ انہیں آبائی ورثوں میں ایک ورثہ فنِ خوش نویسی کا بھی ہے جس میں اہلِ کشمیر زمانۂ دراز سے مشہور چلے آرہے ہیں اور راقم الحروف نے اُن کے اس کارنامہ کو اپنے تذکرہ "خوش نویسانِ کشمیر" میں بھی اُجاگر کیا ہے۔ ریاست کی کلچرل اکیڈیمی نے اس جانب توجہ کر کے ۱۹۷۱ء میں اس کے احیاء کی از سرِ نو کوشش کی۔ عملی طور پر ماضی کے اس بھولے بسرے فن کی اشاعت کے لئے فنِ خوش نویسی اور خطاطی کی اپنے ماتحت ایک درس گاہ قائم کی اور اس درس گاہ کے سب سے پہلے صدر مدرس مرحوم پیر محمد افضل مخدومی مقرر ہوئے۔ افسوس کہ یہ شریف اور اعلیٰ کام ابھی ڈیڑھ دو برس ہی کرنے پائے تھے کہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور اس خدمت سے سبکدوش ہوگئے، مگر جو کام آپ کے مبارک ہاتھوں سے بنیاد پذیر ہوا تھا الحمد للہ وہ کام ابھی تک کلچرل اکادمی میں بخیر و بخوبی انجام پارہا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی انجام پاتا رہے گا۔ دراصل یہ آپ کے خلوص اور اس فن سے محبت کا نتیجہ تھا۔ خواجہ حافظ نے اسی محبت و خلوص کے بارے میں اپنے اس مشہور شعر میں کہا ہے ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی　　بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

یعنی ہر وہ تعمیر جو ثبت سے خالی ہے وہ یقیناً خلل پذیر ہے اور چونکہ پیر صاحب کو فن کتابت سے دلی محبت تھی اس لئے اکادمی میں آپ کا لگایا ہوا پودا الحمدللہ ترو تازہ اور شگفتہ ہے، اگرچہ پیر صاحب کی لحیم و شحیم خوبصورت اور قد آور شخصیت آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔

کلچرل اکادمی میں فن خوشنویسی کی کلاس کے افتتاح کے سلسلے میں راقم کو منشی احمد شاہ مخدومی نے جو پیر محمد افضل مخدومی کے ہم رشتہ بھی ہیں، بتایا کہ اس کلاس کے آغاز سے قبل مولوی محمد سعید صاحب مسعودی اور جناب محمد یوسف صاحب ٹینگ سیکریٹری اکادمی خاص طور پر آپ کے مکان واقع محلہ زری بل، خانیار تشریف لائے تھے اور باصرار اُن سے اس کلاس کی صدر مدرسی قبول کرنے کی استدعا کی تھی۔ مخدومی صاحب چونکہ ان دونوں حضرات کا بے حد احترام کرتے تھے، اس لئے ان کے کہنے کو ارشاد سمجھتے ہوئے یہ عہدہ قبول کر لیا اور پورے خلوص اور لگن سے اپنا کام سر انجام دیتے ہوئے بحالت مجبوری اُس سے الگ ہو گئے۔

تاریخ کشمیر میں بیسویں صدی عیسوی کا نصف اول سیاسی اتھل پتھل کا وقت تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ریاست میں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کو جنم دیا۔ ان میں نیشنل کانفرنس کے سربراہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ اور مسلم کانفرنس کے میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم تھے۔ مرحوم پیر محمد افضل مخدومی کا تعلق نیشنل کانفرنس کے آغاز سے ہی شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ تھا۔ اس سلسلے میں آپ نیشنل کانفرنس کے نہ صرف پارٹی ممبر ہی تھے بلکہ بقول راویان نیشنل کانفرنس حلقہ خانیار کے پریذیڈنٹ یا صدر بھی تھے۔ تاہم نیشنل کانفرنس سے وابستگی کے باوجود آپ کو سرینگر کشمیر کے میر واعظ خاندان کے علمائ کا بھی پورا احترام

اور قدر و منزلت تھی جیسا کہ مولوی حسن شاہ صاحب وفائی کے ذکر میں آپ کے بیان سے عیاں ہے۔ نیشنل کانفرنس کے آغاز میں اگرچہ آپ مولوی محمد سعید مسعودی اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی مجالس میں زیادہ آمد و رفت رکھتے تھے لیکن عمر کے اخیر میں اس جذبہ میں کمی پاکر گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اس میں کچھ علالت کا اثر بھی تھا اور کچھ اکادمی کی ملازمت کا بھی۔ بہر کیف مرحوم پیر محمد افضل مخدومی خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے، بحیثیت مجموعی مرنجان مرنج اور اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے، اور جو لوگ آپ کے منکر ہیں انہیں قاسم حریری متوفی ۵۱۶ھ (۱۱۲۲ء) کے یہ عربی اشعار نوٹ کر لینے چاہئیں:

سامِحْ اَخاكَ اِذا خَلَطْ مِنْهُ الْاِصَابَةَ بِالْغَلَطْ
وَتَجافَ عَنْ تَعْنِيْفِهٖ اِنْ زَاغَ يَوْماً اَوْقَسَطْ
مَنْ ذَا الَّذِيْ مَاسَاءَ قَطُّ وَمَنْ لَهُ الْحُسْنىٰ فَقَطْ

(ترجمہ: اے مخاطب اپنے بھائی سے جب اس کی درستی غلطی سے مل جائے تو چشم پوشی سے کام لے کسی دن اگر ٹیڑھا ہو جائے تو سرزنش اور جھڑکنے سے اجتناب کر۔ دنیا میں ایسا کون شخص ہے جس نے کبھی برائی نہیں کی اور جس کی فقط نیکیاں ہی نیکیاں ہیں)۔

متذکرہ صدر بیان کا تمام تر خلاصہ یا ماحصل یہ ہے کہ مرحوم پیر محمد افضل مخدومی بحیثیت کاتب، سیاستدان اور انشاء پرداز بیسویں صدی عیسوی کے کشمیر کی ایک اہم اور معزز شخصیت تھی۔ انہوں نے کشمیر میں فن خوش نویسی کو عروج بخشا، حقیقی اور چشم دید تاریخی واقعات لکھنے کی بنیاد ڈالی اور ریاست کی سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی وہ قدر و منزلت اور شہرت نہ ہوئی جو ان کے ہم نام مرزا محمد افضل بیگ اسلام آبادی کو ہوئی۔ لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں۔ پیر صاحب مرحوم

اگرچہ تمام عمر خودنمائی اور شہرت سے گریزاں رہے اور کبھی اس کی تمنا نہ کی تاہم بقول خلیل مطران:

یُخْفِی الْکَرِیْمُ مَکَانَہُ   فَتَرَاہُ اَطْیَارُ السَّمَاءْ

(ترجمہ: سخی اپنی جگہ پوشیدہ رکھتا ہے مگر آسمان کے پرندے اُسے دیکھ ہی لیتے ہیں)

یہی کیفیت ہمارے زیرِ بحث مرحوم پیر محمد افضل مخدومی خانیاری کی ہے۔ بالآخر یہ سرگرم و پرجوش لیکن خاموش بندۂ خدا منگلوار ۱۳ رجب المرجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۵ مارچ ۱۹۸۶ء کو داغِ مفارقت دے کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے خالق سے جا ملا۔ غالباً زندگی پنج روزہ کے ستّر یا بہتّر برس پورے کئے تھے۔ لوحِ مزار پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ

مجاہدِ آزادی، صاحبِ علم و دانش، زرّیں رقم، ابوالقلم پیر محمد افضل مخدومی مغفور،

سہ شنبہ ۱۳ رجب المرجب ۱۴۰۶ھ = ۲۵ مارچ ۱۹۸۶ء



سائیں فقرالدّین

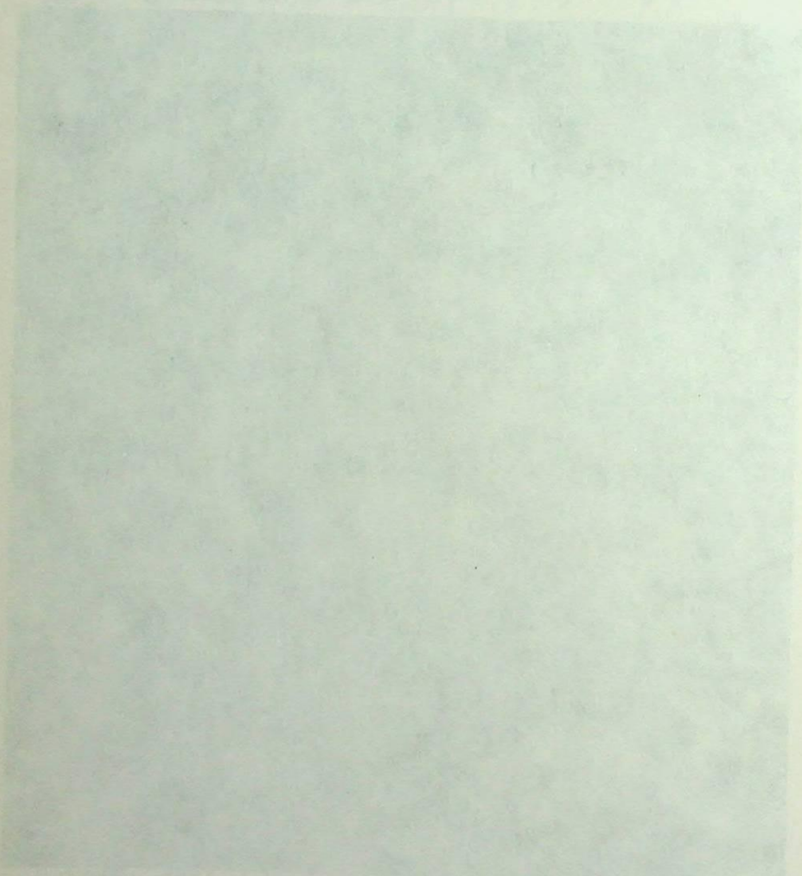
سائیں فقرالدّین علاقہ پونچھ راجوری میں صوفی تحریک سے متاثر شاعروں کی آخری جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا انتقال پچاسی ۸۵ سال کی عمر میں ۲۴ مارچ ۱۹۸۷ء بدھوار کو موضع نیٹریاں میں ہوا لیکن آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے جسدِ خاکی کو پونچھ شہر سے تین میل مغرب میں موضع دیگوار میں اُن کے گھر کے قریب ایک ٹیلے پر سپردِ خاک کیا گیا جہاں اُن کے عقیدت مند ایک عالیشان زیارت تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ زیارت دیگوار ملدیالاں کے میدانی خطے سے ہٹ کر چتری کوٹ کے پہاڑی سلسلے کے درمیانی اُونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اس باکمال شاعر، بے مثال صوفی بزرگ اور کامل فقیر کی فطرت کیساتھ والہانہ محبت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علاقہ پونچھ میں شاید ہی کوئی اور مقام اتنا قابلِ دید اور قدرتی مناظر سے مالا مال ہوگا۔ اس پُر رونق اور پاک مقام سے شمال کی جانب نظر دوڑائیں تو حاجی پیر کے خوبصورت جنگل دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ زیارت کے عین سامنے

بتیاڑ دریا کے اُس پار پونچھ کا شہر، قلعہ مُبارک، ہوائی گراؤنڈ، بلدیو محل موتی محل، مندروں کے کلش اور مسجدوں کے گنبد دکھائی دیتے ہیں۔ پھر وادی پونچھ میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے شالی اور مکئی کے کھیت نظر آتے ہیں اور پھر اِن کھیتوں سے نظر اُوپر اُٹھائیں تو پیر پنچال کی چوٹیاں برف کی دستاریں سجائے استقبال کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ غرض، سائیں فقر الدّین کی زیارت والا یہ مقام نہ صرف اُن کے مریدوں اور عقیدت مندوں کیلئے باعث کشش ہے بلکہ فطرت کے حسن سے رغبت رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے یہ پُر تقدّس جگہ سکون اور تسکین کا باعث بن سکتی ہے۔ اس جگہ پہونچ کر آدمی شاعر سائیں کے نظرِ انتخاب کی داد دئے بنا نہیں رہ سکتا کہ رنگین مزاج سائیں نے اپنی آخری قیام گاہ کے لئے ایک ایسے مقام کو منتخب کیا تھا جو ہر لحاظ سے اسکے شایانِ شان ہے۔ سائیں صاحب کی پنجابی شاعری کے فن اور صوفی نظریات پر بات کرنے سے پہلے آیئے اِس بزرگ فقیر اور پنجابی شاعر کے حالاتِ زندگی اور اُن کے فن پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

سائیں فقر الدّین کی ولادت غالباً ۱۹۰۲ء میں موضع پٹھانا تیر تحصیل مینڈھر میں بڈہانہ گجر خاندان میں ہوئی تھی۔ خود سائیں صاحب اپنے گاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں ؂

ملک نوری ضلع پونچھ میرا مینڈھر وطن تے خاص تحصیل اُوتھے
پٹھانا تیر فقر دا پنڈ پہلا سلواہ ڈاک خانہ دو میل اُوتھے

(پونچھ میرا نوری وطن ہے اور تحصیل مینڈھر کے گاؤں پٹھانا تیر کا رہنے والا ہوں جہاں سے ڈاک خانہ دو میل کی دوری پر سلوا گاؤں میں پڑتا ہے)





سائیں فقر الدین

آپ کے والد کا نام دریا بخش اور دادا کا نام غریبا تھا'

آپ کے بچپن کا نام فقرا تھا۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی آپ نے اپنا نام سائیں فقرالدّین رکھا۔ گاؤں میں کوئی درسگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کسی سکول میں تو باضابطہ تعلیم حاصل نہ کرسکے لیکن مکتب میں مولوی صاحب سے اسلامی تعلیم حاصل کی اور لکھنا پڑھنا بھی سیکھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی فقیری کیطرف طبیعت مائل ہوگئی۔ جب وہ مویشی چرانے کیلئے جاتے تو اللہ کے نام کے ورد کرتے کرتے اکثر وجد میں آکر بے ہوش ہوجایا کرتے۔ بس، جہاں بھی گاؤں میں ڈھول بجتا سائیں جی پر وجد طاری ہوجاتی۔ گھر والوں نے فقرالدّین کا رجحان فقیری کی طرف دیکھ کر اُن کی شادی کرنے کی سوچی تاکہ گھریلو زندگی میں اُن کا دِل لگ سکے۔ چنانچہ بائیس[۲۲] سال کی عُمر میں گاؤں میں ہی اُن کی پہلی شادی ہوئی۔ ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو بارہ[۱۲] سال کی عُمر میں فوت ہوگئی۔ پھر پہلی بیوی سے کوئی بچّہ پیدا نہ ہُوا۔ گھر والوں نے اولاد کی غرض سے دُوسری شادی کرادی۔ یہ شادی بگھی نامی عورت سے ہوئی۔ یہ عورت بڑی چڑچڑی اور کوُر مغز تھی۔ بات بات پر سائیں صاحب سے جھگڑتی اور انہیں تنگ کرتی۔ دوُسری جانب سائیں فقرالدّین کے چچازاد بھائیوں نے زمین کے جھگڑوں میں پھنسا کر انہیں نہایت پریشان کردیا۔ اِن حالات میں سائیں صاحب کا دِل اُچاٹ ہوگیا۔ اب وہ کئی کئی گھنٹے مُراقبے میں رہنے لگے۔ بے ہوشی کا عالم بھی بڑھنے لگا۔ دِن کو چلّہ کاٹتے اور رات کو کسی خانقاہ میں جاکر لیٹ جاتے۔ اِسی دَوران اُنہوں نے شاعری شروع کی اور اپنے بارے میں لکھا ۔

سائیں فقرالدّین ملنگ میاں
گل کرتاباں نال بنگ میاں
ترا اللہ نال ایہہ سنگ میاں
بول لا اِلٰہَ اِلّا اللّٰہ

(میں سائیں فقرالدّین ملنگ فقیر ہوں میرے گلے میں فقیری
کُرتا اور ہاتھوں میں کڑا ہے اور میری لو اللہ کیساتھ لگی ہے۔)

شاعری کی ابتداء اُنہوں نے سی حرفیوں سے کی۔ یہ سی حرفیاں عشقِ الٰہی میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں اور اِن میں ظاہر داری کے بجائے سیدھا اللہ کے ساتھ تعلق جوڑنے کا درس ملتا ہے۔ سائیں جی گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کرتے اور انہیں اپنا معرفت بھرا کلام اس انداز میں سُناتے کہ سُننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ لوگ اُن کے کلام کو زبانی یاد کر کے ایک دُوسرے کو سُنانے لگ پڑتے تھے اسطرح سائیں صاحب کا دائرۂ اثر بڑھنے لگا۔ ان ہی دِنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جسنے سائیں صاحب کو گھر چھوڑ کر فقیر بننے پر آمادہ کر دیا۔ خود اُن کے ایک بیان کے مُطابق ۱۴ چیت کا دِن تھا جب رات کے وقت وہ اپنے گندم کے کھیت میں مچان پر بیٹھ کر کھیت کی جنگلی درندوں سے رکھوالی کر رہے تھے اُن کے ساتھ ایک کُتیا بھی تھی۔ جب رات آدھی سے زیادہ ہوئی تو سائیں صاحب کو گُندم کے کھیت میں کچھ کھڑکھڑاہٹ سی سُنائی دی۔ سائیں صاحب نے سوچا شاید کوئی درندہ فصل تباہ کرنے آیا ہے۔ اُنہوں نے کُتیا کو ساتھ لیا اور اُسطرف دوڑے جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ لیکن جب وہ اُس مُقام پر پہنچے تو انہیں انتہائی چمکتی

شے (نور کا جلوہ) دکھائی دی۔ اِس نور کو دیکھ کر سائیں صاحب وہیں بے ہوش ہو گئے اور کُتیا مر گئی۔ دوسرے دِن صبح جب ہوش میں آئے تو اُسی وقت گھر بار تیاگ کر صحرا نوردی اختیار کر لی۔ یہاں سے بھاگ کر پنجاب چلے گئے پھر ۳۲ سال تک گاؤں گاؤں شہر شہر گھومتے رہے۔ لیکن زیادہ تر عرصہ وہ لاہور میں رہے۔ اِسی دوران ایک جٹی سے اُن کو عشق سا ہو گیا لیکن جلد ہی اُنہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ پنجاب میں سائیں صاحب کو ایک کامل فقیر کا دیدار بھی نصیب ہوا جسکی رفاقت نے اُنہیں ایک کامل فقیر بنا دیا۔

پنجاب سے واپس آکر سائیں صاحب نے دُوسری بیوی کو طلاق دی اور خود پوری طرح فقیری کیطرف راغب ہو گئے اور صوفیانہ شعر کہنے لگے۔ اِسی دوران اُنہوں نے کشمیر کا سفر کیا اور نانگا باجی کے در پر حاضری دی۔ نانگا باجی نے سائیں فقرالدّین کی بزرگی، فقیری اور صوفی نظریات پر مبنی شاعری کی بہت تعریف کی۔ سائیں صاحب کو بھی نانگا باجی کی صورت میں کامل پیر مِل گیا اور وہ اُن کے مُرید ہو گئے۔ نانگا باجی نے سائیں فقرالدّین کو حکم دیا کہ جنگلوں میں بھٹکنے، کھنڈروں میں راتیں گزارنے اور ویران جگہوں میں چلّے کاٹنے کے بجائے انہیں شادی کر کے گھر بسا لینا چاہیئے اور اپنے ٹھکانے پر شریعت کیمطابق آپ کو عبادت اور ریاضت میں لگانا چاہیئے اسی میں اُن کی نجات پنہاں ہے۔ کشمیر کے اِس پیر نے سائیں صاحب سے ایک بڑا چلّہ بھی کٹوایا۔ سائیں فقرالدّین نانگا باجی سے بہت زیادہ مُتاثر ہوئے اور ہمیشہ کے لئے انہیں اپنا مُرشد تسلیم کر لیا۔ خود رموز الکنج میں کشمیر کے اس پیر

کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

لوڑیا پیر فقیر کامل ہادی فیض رسان کشمیر میرا
سرینگر تھیں ٹپ کے ونڈپورہ ملن گام دے پنڈ دا پیر میرا
سیّد خاص رسول دی آل وچوں جس توڑیا کفر زنجیر میرا
ہویا نام رسول شاہ فقیر دینا اوڑک چھپیا بدرِ منیر میرا

میں نے کامل پیر ڈھونڈ لیا ہے جس کا نام رسول شاہ ہے. جو ہادی اور فیض رساں ہے اور کشمیر کے علاقہ ونڈپورہ کے گاؤں ملن گام میں رہتا ہے. خاص سیّد خاندان سے تعلق رکھنے والے اس پیر نے میرے پاؤں میں پڑی کفر کی زنجیر کو توڑ کر مجھے حق کیطرف موڑا.

اپنے مرشدِ کامل سے فیض پاکر سائیں فقیر الدّین واپس پونچھ آگئے اور مرشد کے حکم کیمطابق تیسری شادی نامری بی بی سے رچائی جو علاقہ سرن کوٹ کے موضع سیدان کی رہنے والی تھی. یہ شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی. اب انہوں نے اپنا آبائی گاؤں پٹھانہ تیر چھوڑ دیا اور پونچھ شہر سے تین میل مغرب میں گاؤں ڈیگوار میں ایک پہاڑی ڈھلوان پر زمین خرید کر یہاں آباد ہوگئے اور رہائش کے لئے دو مکان بھی بنا لئے. اپنی نئی رہائش گاہ کے بارے میں خود سائیں فقیر الدّین لکھتے ہیں ؎

اج میں پونچھ تحصیل حویلی پنڈِ خاص میرا ڈیگوار ویکھو
پکا ڈاک خانہ پونچھ شہر اندر دوئے میل اُنہوں ٹھگی پار ویکھو

آج کل میں ضلع پونچھ کی تحصیل حویلی کے موضع ڈیگوار میں سکونت پذیر

ہوں۔ جو پونچھ شہر سے تقریباً دو میل دور ہے اور میرا گھر شہر کے سامنے نظر آتا ہے۔

اسی دوران اُنہوں نے گاؤں سلوتری میں بھی ایک قطعہ زمین خرید لیا جہاں اکثر اپنے مویشیوں کو لے کر جایا کرتے تھے۔

اب وہ سارا دن بیٹھے سی حرفیاں لکھتے، شعر کہتے اور عشقِ حقیقی پر رمز و کنائیوں کے انداز میں قصّے تحریر کرتے اور مُریدوں میں تبلیغ کرتے، حاجت مندوں کو تعویذ دیتے اور یادِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں گزارتے۔ اسی دوران اُن کی سی حرفیوں کی پہلی کتاب شائع ہوئی جس کا نام "فقراً ہدایت" ہے۔ بتیس [۳۲] صفحوں کا یہ کتابچہ آجکل نایاب ہے۔ اس کے بعد "مدحِ رموز الگنج" اور "ضیا القمر" لکھیں۔ پنجابی زبان کے تئیں اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۴ فروری ۱۹۷۴ء کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے اکیڈیمی کے صدر (اُسوقت کے وزیرِ اعلےٰ سید میر قاسم) نے آپ کو گُلاب بھون جموں میں ۴۰۰ رُوپیہ نقدی اور ایک دُھسہ (شال پشمینہ) پیش کیا۔

۱۹۷۵ء میں اُن کی تیسری بیوی نامری بی بی انتقال کر گئیں۔ اس سے ایک لڑکی بھی تھی۔ اب اُن کے پاس کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو اُن کی دیکھ بھال کر سکتا۔ سائیں خود تو ہر وقت اللہ سے لو لگائے رکھتے یا شاعری کرتے رہتے یا وعظ و تبلیغ میں مصروف رہتے۔ اِن حالات میں سائیں صاحب کو پھر رفیقِ حیات کی ضرورت محسوس ہوئی جو گھریلو کام کاج دیکھتی۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء میں اُنہوں نے چوتھی شادی موضع نیڑیاں میں کی۔ یہ شادی گوجر خاندان کی احمدی بی بی سے قرار

پائی۔ لیکن شادی سے پہلے سائیں صاحب سے احمدی بی بی کے گھروالو
نے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اب اپنی زندگی کے دِن نیڑیاں گاؤں میں
ہی بتائیں گے۔ اس طرح فقیرالدین دیگوار گاؤں میں اپنا گھر وغیرہ
اپنی لڑکی کے حوالے کرکے (جواب بیاہی جا چکی تھی) خود نیڑیاں آ گئے۔ یہ
بات ۱۹۷۵ء کی ہے۔ زندگی کے آخری دس سال اُنہوں نے نیڑیاں
میں ہی گزارے۔ اسی دوران وہ حج بھی کر آئے اور پاکستان میں اپنے
مُریدوں سے مُلاقات کرنے بھی گئے۔ کہتے ہیں کہ ۱۹۸۵ء میں جب وہ
"آزاد کشمیر" پہنچے تو مُریدوں نے اُنہیں پالکی میں بٹھا کر سارے پاکستانی
مقبوضہ کشمیر کا چکر لگوایا تھا۔ آخر ۲۴ مارچ ۱۹۸۷ء کو اُنہوں نے نیڑیاں
گاؤں میں وفات پائی۔ اُن کی چوتھی بیوی احمدی بی بی اُن کا مزار نیڑیاں
گاؤں میں ہی بنانا چاہتی تھیں لیکن اُن کی لڑکی کا کہنا تھا کہ سائیں صاحب
کی وصیّت ہے کہ انہیں گاؤں دیگوار میں دفن کیا جائے۔ بات پولیس
تک پہنچی اور فیصلہ ہُوا کہ اگر سائیں صاحب کی لڑکی قرآن شریف اٹھا کر
کہہ دیں کہ سائیں صاحب نے کہا تھا کہ انہیں دیگوار میں دفن کیا جائے
تو اُن کے جسدِ خاکی کو اُن کی لڑکی کو سونپ دیا جائے گا۔ چنانچہ
سائیں صاحب کی بیٹی نے قسم اُٹھائی اور اُن کے جسدِ خاکی کو دیگوار لیجا کر
دفن کیا گیا۔ جبکہ موضع نیڑیاں میں بھی صاحب کیلئے قبر تیار کی گئی تھی۔
اِس لئے اُس جگہ سائیں صاحب کیلئے بنایا گیا خالی تابُوت دفن کر دیا گیا۔

سائیں فقرالدّین بڑے خوش طبیعت انسان تھے ہمیشہ خوش
رہتے اور دُوسروں کو خوش رکھتے۔ ۸۵ سال کی عُمر میں بھی چُست
اور زندہ دل شخصیت کے مالک تھے۔ لمبا قد، فقیرانہ سبز کُرتا، ہاتھ

میں سوٹی، سفید لمبی داڑھی، منڈوایا ہوا سر، سُرخ چہرہ، تیز عقابی آنکھیں اور لمبوتری ناک والے سائیں، جب رعب داب سے چلتے تو پیچھے مُریدوں اور شیدائیوں کی ٹولیاں ہوا کرتیں۔ جب پونچھ شہر میں تشریف لاتے تو قلعہ مُبارک کے قریب اکثر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی۔ پھر کوئی مُرید اُن کا کلام گانے لگتا اور سائیں خود بھی ساتھ ساتھ اپنے شعروں کی تشریح کرتے جاتے۔

سائیں فقر الدّین کی سماجی اور مذہبی جذبات ایک طرف اُنکی شاعرانہ حیثیت بھی کچھ کم نہیں۔ وہ ایک مرد قلندر اور صوفی بُزرگ تھے۔ جیساکہ سبھی جانتے ہیں کہ صوفی تحریک کا اصل مقصد اِسلام اور تصوّف کی تلمیحات کو عام کرنا تھا۔ صوفی شاعروں نے اِسلامی نظریات کی روشنی میں علاقائی زبانوں میں خُوبصورتی اور مقامی رنگ آمیزی کے ساتھ عشقِ حقیقی کو مجاز کے پردوں میں پیش کر کے عوام کو راغب کیا۔ صوفی ہر لمحہ ذاتِ اِلٰہی کا طالب رہتا ہے۔ وہ دین دھرم کی رسموں سے بالاتر ہو کر محبُوبِ حقیقی سے عشق کرتا ہے۔ اسی چیز کو سائیں فقر الدّین اپنی ایک سی حرفی میں یُوں بیان کرتے ہیں ؎

جناں نوں عِشق دا نُور مِلیا اُناں حج نماز گزارنی کی
دِل جناں دے نُور دے نال دھوتے اُناں اوپروں میل اُتارنی کی
پکڑ جناں نوں عشق نے ذبح کیتا حلق اُناں دے چھُری چا مارنی کی
کفن دفن دی لوڑ نہ فقر دینا قبر اناں دی ہار سِنگارنی کی

صوفی عمل کی جگہ عِشق کا درس دیتا ہے اور عِشق کو ہی وسیلہ بنا کر ہر دم خالقِ حقیقی سے رسائی حاصل کرنے میں محو رہتا ہے۔ صوفی کا

دِل عشقِ ربّانی سے منوّر ہوتا ہے۔ اُس کی آخری منزل محبوبِ حقیقی سے وصال حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اِسی لئے صوفی بُزرگ مجازی باتوں کو علامتیں اور رمز بنا کر اللہ پاک سے اپنی سچّی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ بقول خواجہ حیدر علی آتش ؎

حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی
نہاں جسکو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

خود سائیں فرماتے ہیں ؎

عِشق حقیقی گل مجازی پردے پوش تمامی
دانش مند معلوم کریسن جانے کون عمامی

میرا عشق حقیقی ہے لیکن اظہار کیلئے عشق مجازی کو وسیلہ بناتا ہے
دانشمند اس نکتے کو اچھّی طرح جانتے ہیں لیکن عام آدمی کی سمجھ
سے یہ بات باہر ہے۔

جس طرح کشمیر میں صوفی تحریک مُقامی فلسفیوں سے متاثر ہو کر ریشیت کی شکل میں نمودار ہوئی اِسی طرح پونچھ راجوری کے اکثر پنجابی شعرائے نے پنجاب کے صوفی بُزرگوں سے فیضان حاصل کیا۔ محمّد بوٹا، بُلّے شاہ، سُلطان باہو اور میاں محمد بخش کا معرفت بھرا کلام یہاں دیہاتوں میں نہایت مقبول رہا ہے۔ چنانچہ ان بزرگوں کے کلام کا سائیں صاحب کی شاعری پر بھی بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ سائیں نے رُوحانیت سے مالا مال پنجابی کے اُن سرچشموں سے فیضان حاصل کیا اور پنجابی کی صوفی تحریک سے متاثرہ شاعری کی مشعل کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر اِسی رنگ میں طبع آزمائی کرنے لگ گئے۔ اُنہوں نے عشقِ مجازی کے ذریعے

عشقِ حقیقی کا درس دیا۔ ظاہری نقوش اور علامات کو وسیلہ بنا کر قصے لکھے اور عشق کو شاعری کا بُنیادی نقطہ بنالیا۔ اسطرح انہوں نے نہ صرف عشقِ حقیقی کا درس دیا بلکہ ریاکاری سے اجتناب، وحدت، مساوات اور توحید سے لگاؤ، ہجر کی تڑپ، ذاتِ پاک سے وصال کی خواہش اور تاج و تخت ٹھکرا کر مجذوبانہ زندگی گُزارنے کی تعلیم شہرت اور جاہ و جلال سے نفرت اور انسان سے محبت کا سبق سکھایا ہے۔ چونکہ تصوّف میں حُسنِ مجازی کو عشقِ حقیقی کی اوّلیں منزل تصوّر کیا گیا ہے شاید اسی لئے اُنہوں نے محبوبِ حقیقی کو ایک خوبصورت پیکر کی شکل میں پایا اور پھر اُس کے انگ انگ کی مدح سرائی پر اپنی شاعری نثار کردی۔ اُن کا ہر شعر ظاہری اور باطنی عشق سے آراستہ ہے اور لوگوں کے دِلوں میں اُتر جاتا ہے۔ اُن کے کلام میں تصوّف کی باریکیاں اور حیات و کائنات کے رموز بڑے دلکش انداز میں ملتے ہیں۔ عشق کے جذبے سے اُنہوں نے اپنے دِل کو منوّر رکھا اور دمِ آخر تک عشق کے ذریعے ہی خالقِ حقیقی کے طالبِ دیدار اور وصل کے متمنی رہے۔

آپ نے تین کتابیں لکھیں۔ پہلا کتابچہ سی حرفیوں پر مُشتمل تھا جو اب نایاب ہو چُکا ہے۔ پھر 'مدحِ رموز الکنج' اور 'ضیاالقمر' شائع ہوئیں۔ آیئے اِن دونوں کتابوں کا بھی سرسری جائزہ لیں۔ کیونکہ اُن کی شخصیت کا یہ پہلو (شاعری) میری دانست میں کچھ کم اہم نہیں۔

مدحِ رموز الکنج :- یہ قصہ سائیں فخرالدین نے حضرت غوث الاعظم رح کی کرامات بیان کرنے کی غرض سے تحریر کیا۔ لکھتے ہیں کہ عراق میں ایک نیک بندہ رہتا تھا جس کی بیوی بڑی پارسا تھی۔

اُس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہُوا۔ لیکن بچّے کی پیدائیش سے قبل ہی باپ فوت ہوگیا۔ عورت نے بڑی مشکل سے بچّے کو پالا اور جوان کیا۔ آخر ملک شام میں اس لڑکے کی شادی طے ہوئی۔ عورت نے لڑکے کو دُولہا بنا کر بارات کیساتھ روانہ کیا لیکن شادی کے بعد دُولہا بارات کے ہمراہ جب گھر آرہا تھا تو راستے میں ایک دریا کو عبور کرتے ہوئے دُولہا اور بارات والی کشتی غرق ہوگئی اور سبھی ڈوب گئے۔ جب اس کا علم دُولہا کی بوڑھی ماں کو ہُوا تو اُس نے گھر بار چھوڑ دیا اور روتی چلاتی در در بھٹکنے لگی۔ اِسطرح بارہ[12] سال گُزر گئے۔ ایک دِن بوڑھی گریہ زاری کرتے ہوئے جارہی تھی کہ راستے میں اُسے حضرت غوث الاعظمؒ کے دیدار ہوگئے۔ بوڑھی اُن کے پاؤں پر گر پڑی اور روتے ہوئے حضرت غوثِ پاکؒ سے درخواست کی کہ اُس کے بچّے کو لوٹائیں۔ حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا کہ یہ بات نامُمکن ہے پھر بھی نیاز تیار کرو میں دُعا کروں گا اللہ کو منظور ہُوا تو ساری بارات زِندہ ہو جائے گی۔ چنانچہ بوڑھی نے نیاز تیار کیا۔ حضرت غوث پاکؒ نے دُعا کی۔ دُعا منظور ہوئی اور بارہ[12] سال کے بعد دُولہا اور ساری بارات پھر سے زِندہ ہو گئی۔

یہ قصّہ اگرچہ سائیں نے حضرت غوث الاعظمؒ کی کرامات بیان کرنے کے لئے لکھا۔ لیکن اِسمیں معرفت اور عشقِ حقیقی کے رموز پنہاں ہیں۔ قِصّے کے آخر میں ان رموز کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں[5]

قصّہ ختم ہو پا بڈھی پیر والا لایا جندرا ایں قلمدان اُتے
منہ رکھیا ایں بڈھی پیر والا مخفی رمز ہے ہوا جہان اُتے

ظاہر ہور تے باطنی ہور گلاں رمز سمجھ ساڈھے سمجھان اُتے
بُڈھی بُت تے روح بچہ۔ جنج جاوناں گور مکان اُتے
جیویں خواب تھیں جنج بیدار ہوئی روز حشر نوں لوک اُٹھان اُتے
زمیں تانبیوں تپ کے لال ہوسی عاصی ننگ لاچار میدان اُتے

قصہ بڑھیا اور پیر والا ختم ہوا لیکن میں نے بُڑھیا اور بچے کو مُنہ بنا کر حقیقی صورت کے بارے میں باتیں کی ہیں۔ بڑھیا بُت ہے۔ رُوح بچہ ہے جس طرح قبرستان میں سوئی برات کو پیر نے اُٹھایا ہے اُسی طرح حشر کے میدان میں سب کو جگایا جائے گا اور حساب لیا جائے گا اِس لئے اُس کا دھیان کرو۔

اِس قصے میں سائیں صاحب نے حسن کو بڑے اچھوتے ڈھنگ میں پیش کیا ہے۔ پیش ہے مدحِ رموز الکنج سے ایک اقتباس:۔

گورہ رنگ تے چمکدا نور متھے جیویں چن آوے آسمان وچون
دوئے نین کالے سُرما پاون والے جیویں لاٹ آوے شمدان وچون
سُرخی لباں تے بدن دی دھار تیکھی جیویں آئی تلوار میان وچون
لک بند سینہ یاری شیر وانگوں تھک جاوندی عقل حیران وچون
بند بند تمام تیار کرکے پیدا رُبّ کیتا مُسلمان وچون
اللہ بہت سوہنی تصور چھاپی ہوندی نہیں تعریف زبان وچون
بُت خاک ہو جاوندے فقر دینا مسلہ دیکھ حدیث قرآن وچون

اُس کا رنگ گورا ہے۔ ماتھے پہ نُور چمک رہا ہے جیسے آسمان پر چاند ہے۔ دونوں آنکھیں گہری اور چمکدار ہیں جیسے شمع دان سے روشنی پھوٹتی ہے۔

ہونٹوں پر سُرخی چھائی ہوئی ہے۔ بدن پتلا اور خوبصورت۔ کمر اچھی ہے، سینہ شیر کی طرح، اُسے دیکھ کر واقعی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اللہ نے بہت خوبصورت تصویر بنائی ہے جسکی تعریف مُمکن ہی نہیں لیکن تصویر تو آخر تصویر ہے۔ اُسے ایک نہ ایک دِن فنا ہونا ہے اس لئے اے فقرالدّین تو اس تصویر کو چھوڑ اور اِس مسئلے کو حدیث اور قرآن کی روشنی میں دیکھ تاکہ تیری عاقبت سنور سکے۔

اِسی کتاب کے آخر میں سائیں صاحب نے چار سی حرفیاں بھی پیش کی ہیں جن میں اُنہوں نے معرفت کی باتیں کُھل کر کی ہیں اور عشقِ حقیقی کے بارے میں اپنے خیالات کا اِظہار کیا ہے۔ یہ سی حرفیاں پنجابی اَدب کے فن پارے ہیں۔ اِس پائے کی سی حرفی کہیں اور نہیں ملتی۔ پیش ہے اُن کی ان سی حرفیوں میں سے ایک۔

خیال سی لال خریدنے دا سر خاک سکا گنڈھ بنھ سے چلے
کیتا عمل نہ خاص قرآن اُتے ایتھے گل شیطان دی من سے چلے
کھادا عُمر تمام حرام ایتھے سیاہ دل کیتا گندہ تن سے چلے
دس ڈاہڈیاں دے بینا فقر دیتا ساتھی چھوڑ ایتھے بچّے رن چلے

ہمیں تو لعل خریدنے کی لالچ تھی لیکن خاک کی گٹھڑی سر پر اُٹھائی ہے کیونکہ ہم نے قرآن کے احکامات پر عمل کرنے کے بجائے شیطان کی راہ اختیار کی۔ ہم نے تمام عمر اس دنیا میں حرام کھایا ہے جس سے ہمارا دِل کالا اور بدن گندا ہوگیا ہے لیکن اسے فقرالدّین تو ساتھیوں، دوستوں اور بیوی بچّوں کے لئے جو بُرے کام کرتا رہا ہے وہ تو سب یہاں ہی رہ جائیں گے۔ آگے تو تجھے اکیلے ہی حساب دینا

ہے جہاں حساب لینے والے بہت سخت ہیں تیرا ذرا بھی لحاظ نہ کریں گے۔

ضیاء القمر:۔ یہ سائیں فقر الدین کی دوسری کتاب ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل اِس شعری اَدب پارے میں ظاہر طور پر عشقیہ داستان پیش کی گئی ہے۔ ۱۴۱ ۲ سال پہلے مارگلی گاؤں میں ایک شخص کے دو بیٹے تھے۔ یہ خاندان جٹ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک بیٹے کا نام قمر زمان تھا جبکہ دوسرے کا نام حیدر تھا۔ حیدر کے گھر ایک لڑکا پیدا ہُوا جس کا نام قمر شاہ بان رکھا گیا جبکہ قمر زمان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام رضیہّ رکھا گیا۔ چونکہ رضیہ اور قمر شاہ بان بچپن سے ہی اکٹھے رہتے تھے اِس لئے چھوٹی عمُر میں ہی دونوں میں پیار ہوگیا۔ بڑھتے بڑھتے اِس پیار نے والہانہ عشق کی شکل اختیار کرلی۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر پیار کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے۔ ایک دِن دونوں نے عہد کیا کہ وہ شادی کر کے زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے کے ہوکر رہینگے۔

دوسری جانب اُن کے والدین قمر زمان اور حیدر میں آپس میں نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو نیچا دِکھاتے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اُن میں بھائیوں جیسی کوئی بھی عادت نہ تھی۔

جب عشق نے جوش مارا تو قمر شاہ بان نے اپنے ایک دوست کے ذریعے اپنے والد کو پیغام بھیجا کہ وہ رضیہ سے عشق کرتا ہے اِس لئے اُس کے بیاہ کی بات اپنے بھائی حیدؔر سے

کرے۔ حیدر اپنے بیٹے کی محبت کا خیال کرتے ہوئے قمر زمان کے گھر گیا اور رضیہ کا رِشتہ مانگا لیکن قمر زمان نے رِشتہ دینے کی بجائے حیدر کو خوب گالیاں دیں اور اُسے بے عزّت کر کے گھر سے نِکال دیا۔

قمر زمان کو شک ہو چلا تھا کہ کہیں قمر شاہ بان اُس کی لڑکی کو ورغلا کر نہ لے جائے اِسلئے اُس نے عجلت میں گاؤں نافی بٹ کے ایک شخص جابر جون سے اپنی لڑکی کے رِشتے کی بات پکی کر دی۔ جابر جون نہایت بدصورت اور بدزبان شخص تھا اور رضیہ کو بالکل پسند نہ تھا۔ رضیہ روتی رہی لیکن قمر زمان نے اپنی بیٹی کا بیاہ جابر جون سے کر دیا۔

جابر جون، رضیہ کو بیاہ کر گھر لایا۔ رات کو وصل کی گھڑی آئی تو رضیہ نے جابر جون کو دُور رہنے کی تاکید کی اور قمر شاہ بان سے اپنی محبت کی پوری داستان اُسے سُنا دی۔ جابر جون کو سخت غصّہ آیا اُس نے رضیہ کو بہت پیٹا پھر اُسی رات رضیہ کو گھر سے نِکال دیا۔ رضیہ روتے روتے کسی طرح قمر شاہ بان کے پاس پہنچی اور اُسے بتایا کہ وہ جابر جون کا گھر چھوڑ کر آ گئی ہے اِس لئے وہ اُسے قبول کرے مگر قمر شاہ بان اُسے قبول نہیں کرتا وہ رضیہ کو کہتا ہے کہ چونکہ اُس کا نِکاح جابر جون سے ہو چکا ہے اِس لئے وہ جابر جون کی امانت ہے اور قمر شاہ بان پر حرام ہے۔ اِس طرح قمر شاہ بان رضیہ کو دوبارہ جابر جون کے پاس لے جاتا ہے اور اُس سے اِستدعا کرتا ہے کہ وہ رضیہ کو قبول کرے۔ مگر جابر جون، رضیہ

کو قبول کرنے کی بجائے اُسے طلاق دے دیتا ہے ۔ اب چونکہ رضیہ آزاد ہو چکی ہوتی ہے اِس لئے قمر شاہ بان رضیہ کے ساتھ نکاح کر کے اُسے اپنا بنا لیتا ہے ۔

اس کہانی کے بارے میں سائیں لکھتے ہیں کہ یہ کہانی انہوں نے کسی کتاب سے نہیں لی بلکہ اُن کے اپنے دِماغ کی اختراع ہے ۔ ضیاء القمر کے آخر میں فرماتے ہیں

کسے کتابوں اسے حکایت جے کوئی کڈھ دکھاوے
ملے انعام اساڑی کر فوں رب تھیں بخش پاوے

اگر کوئی اِس قصّے کو کسی کتاب سے لکھا بتا دے تو اُسے میں انعام دوں گا اور اللہ سے وہ بخشش پائے گا ۔

اس قصّے کے بارے میں سائیں فرماتے ہیں کہ اس کہانی اور اِس کے کرداروں کے ذریعے عشقِ حقیقی کو بیان کرنے کا وسیلہ بنایا گیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں

عشق حقیقی گل مجازی پردے پوش تمامی
دانشمند معلوم کریسن جانے کون عوامی
قمر شاہ بان رضیہ بیگم نور پایا مرمر کے
دانشمند اساں سمجھائے قمر گُڑی مُنہ دھر کے

اس قصّے میں عشقِ حقیقی کی بات میں نے مجازی علامتوں سے کی ہے ۔ دانشمند اس نقطے کو سمجھ سکتے ہیں ۔ اصل میں میں نے قمر شاہ بان اور رضیہ کو علامتیں بنا کر عشقِ حقیقی کا اظہار کیا ہے ۔

جب جابر جون کے گھر سے بھاگ کر رضیہ ، قمر شاہ بان

کی پناہ میں آتی ہے تو قمر شاہ بان کسی طرح بھی اُسے اپنی پناہ میں نہیں لیتا کیوں کہ رضیّہ کا نکاح جابر جون سے ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ رضیہ کو صلاح دیتا ہے کہ واپس جابر جون کے پاس چلی جائے۔ جب کہ رضیّہ اپنا تن من' اپنا سب کچھ قمر شاہ بان پر نثار کرنے کو آئی ہوتی ہے۔ وہ قمر شاہ بان کو وصل کی دعوت دیتی ہے لیکن قمر شاہ بان یہ دعوت ٹھکرا دیتا ہے کیونکہ یہ بات غیر اسلامی ہے۔ قمر شاہ بان اور رضیہ کی اس بات چیت کو سائیں فقر الدّین نے بڑے دِل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ اِس کے اقتباس پیش ہیں ؎

کہے رضیہ یا ہتھ مینوں مُفت ملے زر سونا
قمر شاہ بان کہے رب اگے اِک دِن حاضر ہونا

رضیہ کہتی ہے مجھے اپنی باہوں میں لے کر میرے جسم کا چاندی سونا مُفت حاصل کر لو۔ قمر شاہ بان کہتا ہے کہ آخر ہمیں اللہ کے آگے جواب دینا ہے اِسلئے میں ایسا نہیں کر سکتا۔

کہے رضیہ دِل بر جانی ذائقہ چکھ وصل دا
قمر شاہ بان کہیا نہ ہوسی اُتھے کرم فضل دا

رضیہ کہتی ہے اے میرے محبُوب آج وصل کا مزا لے لو۔ قمر شاہ بان جواب دیتا ہے کہ جو وصل شریعت کے اصولوں کے باہر ہو اُس پر اللہ کا فضل نہیں ہوتا۔

کہے رضیہ بعد وصل دے سچی توبہ کر ساں
قمر شاہ بان کہیا انج رونویں کافر ہو کے مرساں

رضیہ کہتی ہے وصل کے بعد ہم توبہ کر لیں گے لیکن قمر شاہ بان

جواب دیتا ہے کہ ایسا کر کے میں کافر نہیں ہونا چاہتا۔

کہے رضیہ مطلب پانواں چھپ گوشے اک جائی
قمر شاہ بان کہیا ہر جائی دیکھئے ذات اللہ ہی

رضیہ کہتی ہے آؤ کسی اندھیرے کونے میں چھپ کر وصل کے مزے لیتے ہیں قمر شاہ بان کہتا ہے کہ اللہ ہر جگہ دیکھ رہا ہے اُس سے کوئی مقام پوشیدہ نہیں۔

اگر دیکھا جائے تو یہ شعر دِل اور دِماغ یا عقل اور جذبات کے غلبہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ شعر فرشتے اور شیطان کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ نیکی اور بدی کے جذبات کی کشمکش کی عکاسی بھی ان سے ہوتی ہے۔ اصل میں رضیہ اور قمر شاہ بان دونوں انسان کے اندر ہیں جن کی ہر لمحہ بجائے خود انسان کے اندر تکرار رہتی ہے۔ سائیں جی کہتے ہیں کہ عشق کے ذریعے ہمیشہ اللہ کی رسی کو تھامے رکھنا چاہیئے۔ وہ عشق کی معّراج بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دِلبر سوہنی صورت دیکھی نہ مُڑیا نہ تھکا
شہوت ختم ہولی تن وچوں عشق جناں دا پکا

دِلبر کی خوبصورتی دیکھ دیکھ کر وہ تھکا نہیں بلکہ اُس کے تن سے شہوت ختم ہو گئی کیوں کہ اُس کا عشق پکا تھا۔

اُنہوں نے اس کہانی کے ذریعے یہ پیغام بھی دیا ہے کہ اللہ کے حضور جب جاؤ گے تو خالی ہاتھ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سِلسلے میں اُنہوں نے بہو اور ساس اور کاج بطور اِنسان خدا اور اعمال اِستعمال کیا ہے۔ پیش ہے ایک اقتباس۔

خالی ہتھ چلی نوں اگے درمِ دینار نہ کالی

اک جواب نہ ہوسی اُتھے پیش جدوں سس آلی
جس کِسے پیکے داج بنایا سوہرے خوشی وسایاں
داج نہیں جس پلے ہوسی دُکھ عذاب سزایاں
داج بناؤ کاج رچاؤ تاں سوہرے سُکھ پاؤ
داج نہ ہویا کاج نہ اچھّا خالی ہتھ نہ جاؤ
داج والی دا کاج سوکھلا سوکھی عمر نبھائی
ترا کاج قریب فقرا پلے نہیں دوانی

تو خالی ہاتھ آگے سُسرال جا رہی ہے تیرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ جب ساس پوچھے گی تو تُو کیا جواب دے گی۔ جس کے پاس جہیز ہوتا ہے اُسے عزّت ملتی ہے، نہیں تو سزائیں دی جاتی ہیں اس لئے اگر اپنی بھلائی چاہتی ہو تو اپنا جہیز بناؤ۔ تا کہ آگے جا کر کچھ کام آسکے۔ اے فقرالدّین ترا کاج (یعنی ملک الموت) اب نزدیک ہے اور تیرے پاس تو دو آنے بھی نہیں تو اپنے مالک کو کیا جواب دے گا۔

پنجابی ادب میں تصوّف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی جو شاعری سائیں فقرالدّین نے کی اُس کا کوئی جواب نہیں۔ اس صوفی بُزرگ نے عشقِ حقیقی کو مجاز کے پردوں میں اتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ شاید ہی کوئی اور شاعر ایسا کر سکا ہو۔ اس ملنگ فقیر نے علامتوں کے ذریعے تمام عمر اللہ پاک سے اپنی سچّی محبت کا اظہار کیا۔ اُن کی شاعری میں اتنی خوبصورتی اور کشش ہے کہ آج بھی دیہاتوں

یں اَن پڑھ لوگ سیف الملوک کے بعد اس سائیں کی شاعری زبانی

گاتے ہیں۔ سائیں قمرالدّین آج ہمارے درمیاں موجود نہیں۔ لیکن پنجابی
ادب میں اپنی شاعری کے ایسے فن پارے چھوڑ گئے ہیں جو انہیں ابد
تک زِندہ رکھیں گے۔ اور جب تک انسانوں کے دِلوں میں عشق موجزن
رہے گا سائیں قمرالدّین کی شاعری زِندہ رہے گی۔



عبدُالغفار لوؔجر

بَس چھوہ غمَن غمخوار توٗہی
اَے شاہ رسولِ عربی ؐ
پَس گوس وَس رَٹتم میٚے ژٕ ہی
اَے شاہ رسولِ عربی ؐ

مرحُوم صمدؔ میر کا یہ نعتیہ کلام آج بھی اُسی طرح عبدالغفار لوؔجر کی میٹھی اور رس بھری آواز میں کانوں میں شہد گھول رہا ہے جس طرح یہ آج سے نِصّف صدی قبل فِضا کی وسعتوں سے جیسے قند و نبات کی بارشیں برساتا تھا۔ یہ وہ آواز ہے جسکا اُس زمانے میں ہر طرف طوطی بول رہا تھا اور انسان کے پُرعزم ہاتھوں نے اس آواز کو اپنے من کے لُبھانے کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقید کر دیا۔

سرزمین پُلوامہ کے ایک پیارے پیارے لیکن سادہ سے گاؤں لاجورہ کی سوندی سوندی مٹّی نے آج سے پورے پچھتّر سال پہلے (سنہ ۱۹۱۲ء میں) اس شعلہ بداماں آواز کو جنم دیا۔ اس شخص

کو "غفار لوبجر" کہا جاتا ہے اور اس نے عروج و کمال کے وہ زینے
تک پھاند لئے۔ جہاں تک ایک عام انسان کی رسائی اگر ناممکن نہیں
تو مشکل ضرور ہے۔ غفار کی چال ڈھال اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہوا کہ
اس کے بہت سارے مدّاحوں نے اپنے نو وارد بچوّں کے نام بھی اسی کی
مناسبت سے غفار یا عبدالغفار رکھدیا۔ ابتداء سے ہی اللہ نے
عبدالغفار لوبجر کے چہرے مہرے کے مناسب خطوط اور دلکش نقوش
عطا کرنے کے ساتھ ساتھ شہد کی مٹھاس میں ڈھلی ہوئی آواز کا جادو
بھی عنایت فرما دیا تھا اور اسکے ساتھ ہی انہیں رب کائینات نے شاعرانہ
سانچے میں ڈھلا ہوا موم کی طرح پگھلتا ہوا دل اور سیماب کی طرح تھرکتے
پھڑکتے اعضاء بھی مرحمت فرما دیئے تھے۔ وہ ابتداء سے ہی ملحقہ دیہات
کی چھوٹی چھوٹی گوّیوں کی ٹکڑیوں کے ساتھ مقامی رنگ میں گانا بجانے
کے ساتھ ساتھ پہلے کشمیری لباس میں ہی بطور رقاص رقص کیا کرتے
تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس فن میں یدِ طولیٰ حاصل کر کے باضابطہ طور
پیشواز پہن کر راگ و رنگ کی محفلوں کو اپنے فنکارانہ رقص سے نور و سرور
کے عجیب سے دلکش عالم میں بدل دیتے تھے۔ غفار کے فن کو زمانۂ
طفولیت ہی سے قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا تھا جس کی دیکھا دیکھی
میں یہیں لاجورہ سے ایک اور آواز غلام محمد میؔر صاحب کی ابھرنے
لگی تھی۔ اس میٹھی آواز کے ساتھ بھی اگرچہ قدرت نے حسنِ صورت اور
حسنِ اخلاق عنایت فرما دیئے تھے تاہم غفار کی ترنم ریز آواز اور
تھرکتے بدن کا مقابلہ کرنے میں میؔر کا سخت ترین ریاض بھی گم گشتہ صحرا
نظر آ رہا تھا۔ ان ایّام میں لاجورہ کے ایک ملحق ترین گاؤں قوئیل کی

آدم خیز سرزمین سے عبدالغفار شاہ درویش کے چہیتے طالب وہاب کرال کی کرامات کا شہرہ سارے علاقے میں چل نکلا تھا اور عام طور پر یہ بات زبان زد عام تھی کہ وہاب کرال نے چاندی کے روپیوں کی نقد تھیلی کے عوض عبدالغفار شاہ صاحب کی درویشی کی پوٹلی خرید لی ہے اور اسطرح اس کی مسیحائی[۳] کے چرچے دور دور تک جا پہنچے تھے۔ اس کا مرغ قلندری جہاں اطراف و اکناف سے لوگوں کو اپنی طرف آنے کیلئے آواز پر آواز دیتا جا رہا تھا وہیں اسی اذانِ سحری[۲] نے عبدالغفار لوجر اور اُن کی مقامی پارٹی کو بھی وہاب صاحب کرال کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اِن دنوں غفار کی پارٹی کے ساتھ زیادہ تر غلام قادر بٹ (مرحوم) نارون، مرحوم محمد رمضان بٹ وہی بوگ، محمد عبداللہ بٹ پنگلنہ اور غلام نبی بٹ ناروہ رہا کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ جب "غفار لوجر" وہاب صاحب کرال کی صحبت میں پہنچے تو وہاب صاحب نے اُن کے مُنہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا اور کہا کہ " جاؤ اب جہاں جاؤ، گاؤ" ۔ پھر غفار اپنے محدود دائرے سے نکل کر دور دور دیہات میں جاکر محفلیں جمانے میں مصروف ہوگیا اور اپنی شہرت میں دِن دوگنی رات چوگنی اضافہ کرنے لگا۔ ان ہی ایام میں لسجن[۳] نے غلام قادر میر، غلام محمد بٹ (ممہ بٹ)، عبدالکبیر بٹ درزی، وستہ رحت (حمام) اور کرالہ پورہ کے حکیم علی محمد میاں قوئیل آیا کرتے تھے۔ غلام قادر میر لسجن[۳] چونکہ عبادات و ریاضات کیساتھ ساتھ موسیقی کے زبردست دلدادہ تھے اُنھوں نے میاں قوئیل کے علی محمد بچہ[۱] کو گانا بجانے کی طرف

---

۱ علی محمد آج کل پاکستان میں رہائیش پذیر ہیں۔

راغب کیا اور محفلیں آراستہ کرانے لگا اور اِنہی کے توسط سے اُنھوں نے بھی وہاب صاحب کرال کی صحبتوں میں آنا جانا شروع کر دیا جہاں اُنہیں "غفار لوجر" کی مقناطیسی کشش اور کہربائی شخصیت نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ غلام قادر میر چونکہ لسجن[3] کے ایک متمول گھرانے کے فرد اور راقم السطور کے ماموں تھے کچھ عرصہ پہلے راقم السطور کے والد بزرگوار خواجہ خضر محمد جو غلام قادر میر کے بہنوئی تھے، اس دُنیائے فانی سے رحلت فرما گئے تھے (اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون) اور اب اس گھر میں راقم السطور اور راقم کی والدہ ہی رہا کرتے تھے۔ لیکن غلام قادر میر کی محفل ساز طبیعت نے نہ صرف اس گھر کے در و دیوار کی خاموشی کو توڑ دیا بلکہ اُنکی موسیقی پسند جبلت نے یہاں علی بچہ توئیل[2]، غلام محمد میر لاجورہ کیعلاوہ عبدالغفار لوجر کو جمع کر کے عجیب سی چہل پہل قائم کر دی۔ غفار اور دوسرے لوگوں کی صدا بہار آواز کے ساتھ ساتھ یہاں پیروں، فقیروں اور درویشوں کا تانتا بھی بندھ گیا۔ ان میں خاص طور پر علی صاحب بابہ گنڈ بڑے نامی گرامی صاحب شریعت فقیر تھے جو یہاں اکثر و بیشتر شب گذار ہوا کرتے تھے اور غفار کی جادو بھری آواز پر دیوانگی کی حد تک فریفتہ تھے۔ اس اعتبار سے ہمارے یہاں ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات ہوا کرتی۔ یہ بات بڑی مشہور ہے کہ یہاں غفار لوجر کی موسیقی کی محفلوں میں جو چائے پانی خرچ ہوا کرتا تھا وہ سب غلام قادر میر کے نام پر غلام محمد گتائی کی دوکان سے اُدھار لیا جاتا تھا۔ پھر جب یہ رقم رفتہ رفتہ بڑھنے لگی تو غلام قادر میر موصوف نے اپنی سواری کا (صمدہ) گھوڑا چالیس روپے کے عوض غلام محمد

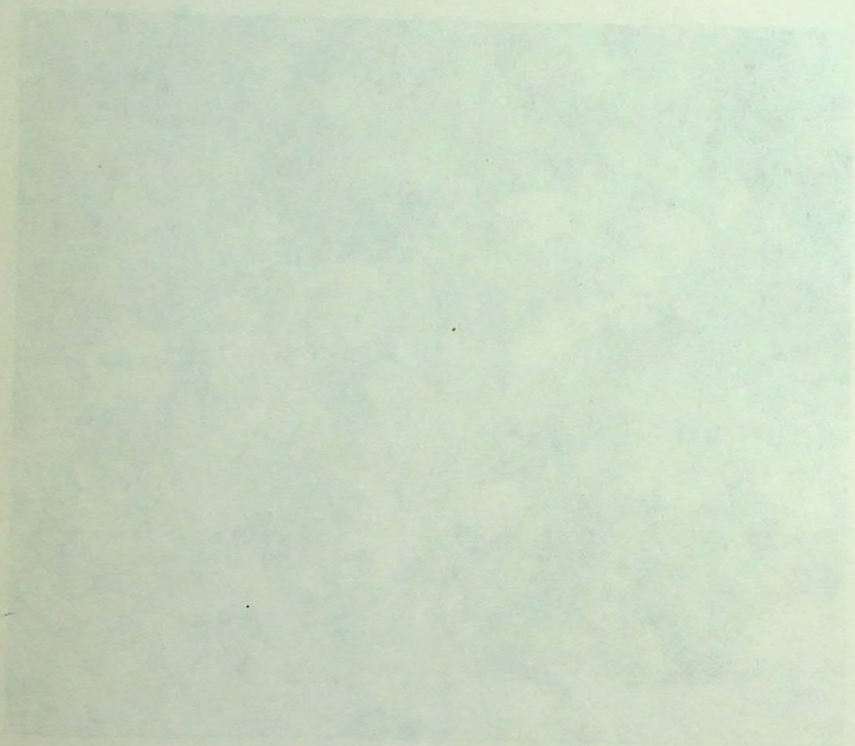
گنائی دُوکاندار کو دے کر قرضۂ موسیقی چکا دیا۔ اُس زمانے میں وہ گھوڑا علاقے بھر میں مشہور تھا اور ہر دُولہے کی سواری کیلئے استعمال ہوا کرتا تھا اور آج اس گھوڑے کی قیمت پچیس سے تیس ہزار رُوپے تک ہوسکتی تھی۔ جب یہ بات اب گلی کوچوں میں سُنی جانے لگی کہ غلام قادر میر لسجن[1] نے غفار لوجر کی مدھر آواز پر اپنی سواری کا گھوڑا نثار کردیا تو اس کے جواب میں غلام قادر میر موصوف زیر لب مُسکراتے ہوئے بزبان حال یہ شعر گنگناتے تھے :-

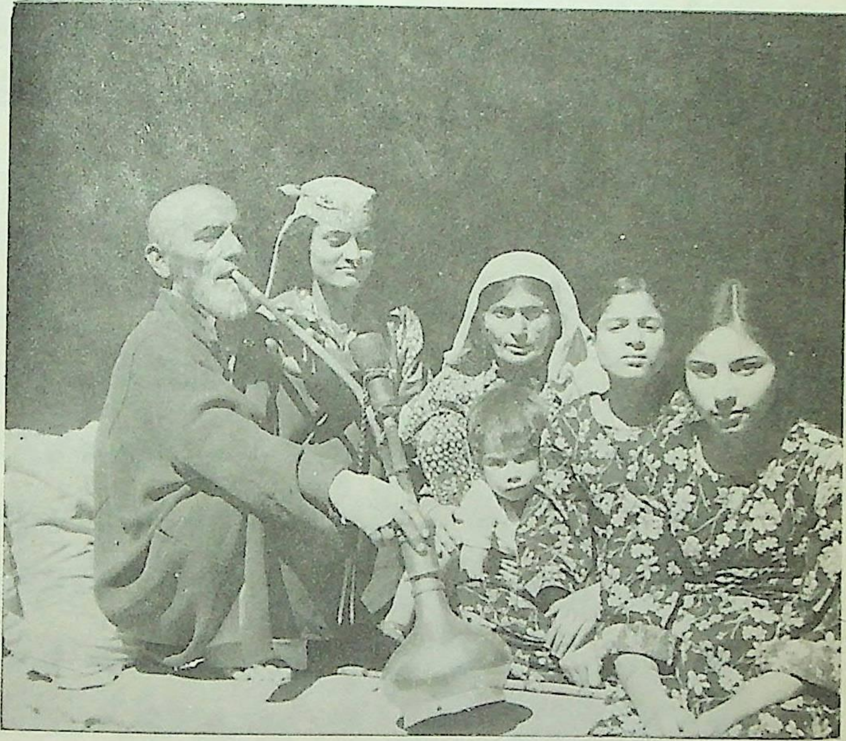
اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

عبدالغفار لوجر کی خداداد فنی صلاحیتوں نے نہ صرف غلام محمد میر لاجوری اور علی محمد بچہ قوئیل کو میدان موسیقی سے کوسوں دُور پچھاڑ دیا بلکہ اس نے ریاست کے اندر اور ریاست سے باہر بھی اپنی آواز کا جادو جگا کر اپنے فن کا سکہ بٹھا دیا۔ ان دنوں متحدہ پنجاب، لاہور، دِلی اور پشاور میں گراموفون کمپنیاں اچھے اور نامور گلوکاروں کی آواز میں مختلف زبانوں میں اچھے اچھے گانے صدابند کراتی تھیں۔ چنانچہ عبدالغفار لوجر کو بھی چند کشمیری گانے ریکارڈ کرانے کی دعوت مِلی۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے ساتھ قوئیل کے امربٹ، مندنہ کے عبدالکریم ڈار (طنبوری) اور محمد رمضان ڈار طنبوری، لاجورہ کے عبداللہ بٹ اور چھانہ پورہ کے احدلون کو ساتھ لے کر لاہور اور

---

[1] غلام قادر لسجن مشہور مجاہد آزادی اور سابق ایم۔ایل۔اے چاڈورہ میر مصطفےٰ کے والد بزرگوار تھے۔





عبدالغفار لوجر
(اہلِ خانہ کے ساتھ)

پشاور کی گراموفون کمپنیوں میں کئی نعت اور گانے صدابند کروائے جن میں مرحوم صمد میر کا یہ نعتیہ کلام سرِفہرست ہے ؎

بَس چھوہ غمن غمخوار تو ہی
اَے شاہ رسولِ عربیؐ

عبدالغفار لوجر نے فنِ موسیقی کی اِبتدائی تربیت کسی سے بھی حاصل نہیں کی تھی۔ یہ تحفہ تو صرف اور صرف اُنہیں خالقِ ازل کی طرف سے ودیعت تھا۔ البتہ اُن کے ظاہری اور رُوحانی رہبر مرحوم عبدالاحد زرگر تھے اور وہ اکثر و بیشتر اُن کے پاس جایا کرتے تھے اور وہ بھی "لوجر" صاحب کے گھر وقتاً فوقتاً آیا کرتے تھے۔ زرگر صاحب کے ساتھ راقم الحروف کی پہلی اور آخری مُلاقات لوجر صاحب کے گھر میں ہی ہوئی ہے۔ اُس روز غفار لوجر نے نعتِ رسولؐ کے بعد زرگر صاحب کا یہ کلام اُس وقت آمیز انداز میں پیش کیا کہ سامعین کی آنکھیں تر ہوتی چلی گئیں ؎

یَس عہ ستھ نکاح چھُے باتدبیر
تِہنزے بَبہ چھُو دَمہ دَمہ شیر
یُتھنہٕ گانگل کَرِی کاتھہ اَغیار
کافر سَپدِ تھ کوٗر میٚے اقرار

O

بُرقعہ تھوٗد تُل ہاو اَسہِ ماہِ تابان
چھانہٕ جلوٗک سُندرِی اَسہِ اَرمان
دارِ پیٹھ چھیکھہ روے روپوش تھاوِتھ

مارِ کُلمار بَردوش یلہ ترآوِ تھ
کارِ پِتہِ چھیکھ عاشقن بُچھہ ناوان
چانہِ جلوٗک سُندری اَسہِ ارمان

o

احد زرگر کس اَندن عشقِنہٕ نیائے
خوٗبصوٗرت آسان بے پرَواے
عشقہٕ نارِ چھہِ ژھعنہٕ ناآلی کوہ وبیابان
چانہِ جلوٗک سُندری اَسہِ ارمان

o

مرحوم عبدالاحد زرگر کے علاوہ عبدالغفار لوجر زیادہ تر صوفی شعراء ہی کا کلام گایا کرتے تھے جن میں خاص طور پر محمود گامی، شمس فقیر، نعمہ صاحب، رحیم صاحب، شاہ غفور اور سوچھہ کرال کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ رسول میر کا کلام خاص خاص محفلوں میں ہی گایا کرتے تھے۔ لیکن یہ بات علم ہے کہ لوجر صاحب پر زیادہ اثر زرگر صاحب ہی کے کلام کا تھا اور کبھی کبھی جب خود بھی شعر لکھا کرتے تھے تو زرگر صاحب سے ہی اصلاح لیا کرتے تھے۔ یوں تو لوجر صاحب نے کسی سکول میں نہ باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی کسی اِدارے میں فنِ موسیقی کی تربیت پائی تھی البتہ اپنی خداداد قابلیت اور مُسلسل ریاضت سے وہ فن اور شہرت کے بامِ عروج تک پہنچ گئے۔ مکتبی تعلیم کے لحاظ سے اگرچہ وہ بالکل کورے تھے تاہم اُن کے بچوں نے اور اُن کے برادرِ اصغر مرحوم غلام محمد خان، جو ایک سرکاری سکول

کے اُستاد تھے، نے لوجر صاحب کو پڑھایا لکھایا جس کی مدد سے وہ مختلف شعراء کا کلام خاص طور پر اپنے مرشد کامل مرحوم عبدالاحد زرگرؔ کا کلام لکھ کر حفظ کیا کرتے تھے اور اِسی معمولی علم کی جانکاری نے لوجر کو تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا شعور بخش دیا تھا کہ اب وہ ۱۹۵۸ء کے بعد سے دم مرگ تک قرآن مجید بھی گھنٹے دو گھنٹے تلاوت کیا کرتے تھے۔

غفارؔ صاحب نے اصل میں تیرہ چودہ برس کی عمر میں ہی موسیقی کے میدان میں قدم رکھا تھا اور پھر مختلف مراحل سے گزر کر اپنی زندگی کے آخری ایّام میں تنِ تنہا ستار بجا کر رقت آمیز لہجے میں اور عالمِ سپردگی میں للہ دیدؔ، نُندہ ریشیؔ اور عبدالاحد زرگرؔ کا کلام گایا کرتے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہا دیتے تھے اور پھر زرگرؔ صاحب کے اِس شعر کو عملی شکل دیکر لبقولِ غالبؔ یک گونہ بیخودی کی تمنّا کرتے تھے۔ تصویر ملاحظہ ہو ؎

غالبؔ:- مے سے نِشاط کی غرض کِس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دِن رات چاہیئے

یا

زرگرؔ:- رُباب، کباب، بھنگ، چرس سور میتن میون
حُباب نِش نیرہ زیر ردِاتی چھُ مُدامیون

○

یعنی:- رُباب، کباب، بھنگ، حشیش اور جلن یہ سب عشاق تو میرا ہے
(پھر جب) پیرہن کے دامن سے حباب نکلے گا وہی میرا مُدعا ہے

لوجر صاحب نے زندگی کا پیشتر حِصّہ خاص طور شباب کا زمانہ سرینگر، اسلام آباد وغیرہ جیسے علاقوں میں گزار کر لاکھوں مداح پیدا کئے۔ تحریک حریّتِ کشمیر میں شیخ صاحب، بیگ صاحب، بخشی صاحب اور دوسرے لوگوں سے اکثر مُلاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور اپنی جادو بھری آواز میں سیاسی پلیٹ فارموں پر شخصی نظام کیخلاف سامعین کے دِلوں میں جوش بھر دیتے تھے۔ اِن جلسہ گاہوں میں اکثر وہ اپنا یا مہجور کا کلام گایا کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ جب لوجر صاحب اپنے فن کا مُظاہرہ کرنے کے لئے لاہور اور پشاور گئے تو انہوں نے دوسرے سیاسی رہنماؤں کے علاوہ کئی نامور گلوکاروں کے ساتھ بھی مُلاقاتیں کیں۔ اِن میں خاص طور پر ملکۂ ترنم نُور جہاں کا نام قابلِ ذِکر ہے جن کی پُروقار اور متین شخصیّت کے علاوہ اُن کی ترنم ریز آواز نے لوجر صاحب کو بے حد متاثر کر دیا تھا جس کا ذِکر لوجر صاحب اکثر کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵.۳۶ء میں اُن کے تعلقات مہجور کے ساتھ اُستوار ہوئے۔ پھر جب "لوجر" نے زرگر صاحب کا یہ کلام سُنا ؎

کافر سَپدِتھ کوٗر مےٚ اقرار

یعنی :۔ سب کو اِنکار کرنے کے بعد میں نے (خدا کا) اقرار کیا۔

تو بذاتِ خود زرگر صاحب مرحُوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کے ساتھ شعر و شاعری، رُوحانیت اور تصوّف پر تبادلۂ خیال کرکے حد سے زیادہ متاثر ہوئے اور وہیں اُن کے ہاتھ پر دست بیعت کی۔ تب سے آخری دم تک زرگر صاحب کے ساتھ پیر مُریدی کے تعلقات اور گھریلو مراسم اُستوار ہوتے گئے۔

لوجر صاحب کی طبیعت فطرتاً صوفیانہ قسم کی واقع ہوئی تھی۔ اسی لئے وہ ہر اُس جگہ پہنچ جایا کرتے تھے جہاں اُنہیں صوفیانہ محافل کی خوشبوئیں گھیر لیتی تھیں اور وہ رُوحانی تشنگی کی پیاس بُجھا سکتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اسی مہک کی کشش سے ترزھل (پلوامہ) کے ایک پہنچے ہوئے بُزرگ صوفی جناب سکندر شاہ کی صحبت میں پہنچ گئے۔ وہاں ہدیتاً اپنی خداداد رس بھری آواز میں اپنا نذرانہ پیش کر رہے تھے کہ اتنے میں اُس وقت کے نائب وزیرِ اعظم[1] مرحوم بخشی غلام محمد بھی سکندر صاحب کی خدمت میں حاضری دینے آئے۔ اُنہوں نے وہاں اپنے پُرانے شناسا غفار کو سوز و گداز کے عالم میں پایا تو بخشی صاحب کی مسرت کی انتہا ہو گئی۔ غفار کو گلے لگا کر ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ اور ریڈیو کشمیر[2] سرینگر پر اپنی جادُو بھری آواز کا جادُو جگانے کی دعوت دی۔ لوجر نے بھی یہ دعوت قبول کر کے ریڈیو کشمیر کے ساتھ اپنی وابستگی قائم کی۔ پھر کئی برس تک عبدالغفار لوجر کی مدھر آواز فضا کی وسعتوں سے اطراف و اکناف تک مدھ بھرے نغمے بکھیرتی رہی۔ ۱۹۵۶ء میں جب رُوسی رہنما بلگانن اور خروشچوف یہاں آئے تو سرکاری دعوت پر لوجر صاحب نے اُنکے سامنے اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کر کے دادِ تحسین حاصل کی۔ اُنہیں غفار صاحب کی آواز اتنی بھائی کہ نئی دہلی پہنچنے پر اُنہوں نے لوجر صاحب

---

[1] یہ ۹ اگست سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو بخشی صاحب وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔

[2] اُن ایام میں ریڈیو ریاستی حکومت کی تحویل میں ہی تھا۔

کو وہیں بُلوایا۔ وہاں بھی اُنہوں نے کشمیری گانوں کو اپنی ترنم ریز آواز

کے سانچے میں ڈھال کر سامعین کے دِل موہ لئے۔ عبدالغفار لوجر
کا یہ سِلسلہ دسمبر ۱۹۶۳ء کے موئے مُقدّس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی
گمشُدگی کے سانحہ تک قایم رہا۔ پھر اس سانحہ سے دِل برداشتہ ہو کر
انہوں نے ریڈیو سے بھی اپنی وابستگی منقطع کرلی اور ایک لحاظ سے
موسیقی کی محفلوں میں جانے سے ہی احتراز کیا۔

لوجر صاحب ۱۹۶۵ء میں زیارت بیت اللہ کو گئے اور
حجِ بیت اللہ سے واپسی کے بعد مکمل طور عبادات و ریاضات اور
اذکار و تلاوتِ کلام پاک میں منہمک ہو گئے۔ گو وقتاً فوقتاً تنہائی
میں شعر و شاعری اور ہلکی پھُلکی موسیقی سے من کو لبھاتے رہے جو
خالص اُنہی کی ذات تک محدُود رہی۔ نمونہ کلام بذیل مُلاحظہ ہو ؎

غزل

یارِہ چانے جلوِہ ستی پارِہ گومُت عاشقن
نارِ عشقُن للہِ ناوان سوٗر گومُت صابرن
عشقہٕ ژوٗرِن ژوٗرِہ دِل نیو سرحدن رٗوم کھیٛتہٕ
تشنہٕ پیمِتھ، کُشتہٕ گاٮ۪متھ، مُشکِہ چانے منٛز وَتن
وَحدتُک ناد آو عاشقن، کثرت پیٛیہ یک تن
لا ینتھ یم نور واتن تم چھ مُختار وطن
سادِہ دِل فلوا چھ گاٮ۪متھ، یاد ہیتھ پننٕوی وطن
وعدِہ اَسہِ ستی کیٛاہ چھُ کوٗرمُت پادشاہِ مرسلن

٥

لوجہ صاحب کا اصل نام عبد الغفار اور لوجہ اُن کے آبائی گاؤں لاجورہ کی مناسبت سے مختصر ہو کر اُن کے نام کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ جس میں غفار کی ذاتی کاوش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پیار سے اُنہیں غفار بھی کہا جانے لگا تھا۔ وہ ذات کے لحاظ سے خان تھے۔ اُن کے والد بزرگوار مرحوم کا نام ثناء اللہ خان تھا جن کا تعلق لاجورہ کے ایک متمول گھرانے سے تھا۔ وہ پانچ بہن بھائی تھے۔ تین۳ بھائی غفار، محمد رمضان خان، غلام محمد خان اور دو۲ بہنیں عزی بیگم اور رحتی بیگم۔ غفار کا پہلا نکاح ۱۹۳۰ء میں ایک ملحقہ گاؤں نارہ میں انجام پذیر ہوا تھا۔ اُن کی شریک حیات کا نام جانی تھا۔ اُس کے بطن سے صرف ایک لڑکا پیدا ہُوا تھا۔ لیکن شادی کے تین سال گزرنے کے بعد دونوں ماں بیٹا واصل بحق ہو گئے۔

لوجہ صاحب کی دوسری شادی ۱۹۳۶ء میں اپنے ہی گاؤں لاجورہ میں عمل میں لائی گئی۔ اُن کی بیوی بقید حیات ہیں۔ اُن کے بطن سے دو۲ فرزند غلام نبی خان (سیشن جج) اور ڈاکٹر یوسف العمر (ایم۔ایس۔سی۔ پی۔ایچ۔ڈی) جو ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر میں ریاضیات کے سربراہ بنے، اُن کے علاوہ دو دختران رفیقہ بیگم اور راجہ بیگم ہیں۔

عبد الغفار لوجہ فطرتاً بڑے ہی حلیم الطبع، شریف النفس اور ملنسار تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں کیساتھ نہایت ہی شائستگی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور اپنے گاؤں والوں کیساتھ نہایت ہی اچھا سلوک کرتے اور پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک باپ کی حیثیت سے وہ اپنے بچوں کے بڑے مشفق

کو وہیں بُلوایا۔ وہاں بھی اُنہوں نے کشمیری گانوں کو اپنی ترنم ریز آواز کے سانچے میں ڈھال کر سامعین کے دِل موہ لئے۔ عبدالغفار لوجر کا یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۶۳ء کے موئے مُقدّس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گمشُدگی کے سانحہ تک قایم رہا۔ پھر اس سانحہ سے دِل برداشتہ ہوکر انہوں نے ریڈیو سے بھی اپنی وابستگی منقطع کرلی اور ایک لحاظ سے موسیقی کی محفلوں میں جانے سے ہی احتراز کیا۔

لوجر صاحب ۱۹۶۵ء میں زیارت بیت اللہ کو گئے اور حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد مکمل طور عبادات و ریاضات اور اذکار و تلاوتِ کلام پاک میں منہمک ہوگئے۔ گو وقتاً فوقتاً تنہائی میں شعر و شاعری اور ہلکی پھُلکی موسیقی سے من کو لبھاتے رہے جو خالص اُنہی کی ذات تک محدُود رہی۔ نمونہ کلام یذیل مُلاحظہ ہو:

غزل

یارہٕ چانے جلوہٕ سیتی پارہٕ گومُت عاشقن
نارِ عشقُن للہٕ ناوان سوٗر گومُت صابٕرن
عشقہٕ ژوٚرن ژوٚرِہ دِل نیو سر حدن روٗمہِ کھٕژِتھ
تشنہٕ پییمتِھ کُشتہٕ گاٮ۪متہٕ، مُشکہٕ چانے منتروٚ تن
وَحدتُک ناد آو عاشقن، کثرت ییہ بک تن
لا بنتھ یم نور واتن تم چھ مُختار وطن
سادہٕ دِل قلوا چھ گاٮ۪متہٕ، یاد ہیتھ پننُوی وطن
وعدہٕ اسہٕ سیتی کیاہ چھُ کوٚرمُت پادشاہِ مرسلن

لوجہ صاحب کا اصل نام عبد الغفار اور لوجہ اُن کے آبائی گاؤں لاجورہ کی مناسبت سے مختصر ہو کر اُن کے نام کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ جس میں غفار کی ذاتی کاوش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پیار سے اُنہیں غفار بھی کہا جانے لگا تھا۔ وہ ذات کے لحاظ سے خان تھے۔ اُن کے والد بزرگوار مرحوم کا نام ثناء اللہ خان تھا جن کا تعلق لاجورہ کے ایک متمول گھرانے سے تھا۔ وہ پانچ بہن بھائی تھے۔ تین بھائی غفار، محمد رمضان خان، غلام محمد خان اور دو بہنیں عزی بیگم اور رحتی بیگم۔ غفار کا پہلا نکاح ۱۹۳۰ء میں ایک ملحقہ گاؤں ناروہ میں انجام پذیر ہوا تھا۔ اُن کی شریک حیات کا نام جانی تھا۔ اُس کے بطن سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ لیکن شادی کے تین سال گزرنے کے بعد دونوں ماں بیٹا واصل بحق ہو گئے۔

لوجہ صاحب کی دوسری شادی ۱۹۳۶ء میں اپنے ہی گاؤں لاجورہ میں عمل میں لائی گئی۔ اُن کی بیوی بقید حیات ہیں۔ اُن کے بطن سے دو فرزند غلام نبی خان (سب جج) اور ڈاکٹر یوسف العمر (ایم۔ایس۔سی۔ پی۔ایچ۔ڈی) جو ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر میں ریاضیات کے سربراہ بنے، اُن کے علاوہ دو دختران رفیقہ بیگم اور راجہ بیگم ہیں۔

عبد الغفار لوجہ فطرتاً بڑے ہی حلیم الطبع، شریف النفس اور ملنسار تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں کیساتھ نہایت ہی شائستگی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور اپنے گاؤں والوں کیساتھ نہایت ہی اچھا سلوک کرتے اور پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک باپ کی حیثیت سے وہ اپنے بچوں کے بڑے مشفق

اور محبّ تھے اور گھر والوں کے ساتھ حد سے زیادہ اُنس ومحبت رکھتے تھے۔

فروری ۱۹۸۸ء سے لوجرہ صاحب کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی۔ وادی کے مشہور ومعروف معالجوں کے ساتھ اُن کے پہلے ہی سے اچھّے مراسم تھے جن میں خاص طور پر ڈاکٹر علی محمّد جان (مرحُوم) اور ڈاکٹر غلام قادر علاقہ بند صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُنہوں نے لوجر صاحب کا عِلاج کیا اور آپریشن کا مشورہ دیا۔ لیکن لوجر صاحب آپریشن کیلئے آمادہ نہ ہوئے پھر ڈاکٹر سیٹھی جو ہومیو پیتھی میں خاصا دسترس رکھتے ہیں نے اُن کا عِلاج کیا۔ گو کہ وہ اِس عِلاج سے کافی حد تک صحت یاب نظر آتے تھے۔ لیکن اچانک ۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ء اتوار کو لوجر صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور صبح آٹھ بجے اُن کے دِماغ کی رگ پھٹ گئی اور اِسی روز شام کے سوا چار بجے داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنے خالقِ حقیقی کے ساتھ جا ملے۔

پھر دیر گئے اپنے ہی آبائی قبرستان میں سپُردِ خاک کئے گئے۔

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا



جانکی ناتھ زُتشی

شری جانکی ناتھ زُتشی کا جنم سرینگر میں ماہِ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ آپ کے والد بزرگوار پنڈت وید لعل زُتشی ریاست کے محکمہ مال میں وزیر وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔

جانکی ناتھ زُتشی نے ابتدائی تعلیم مِشن سکول سرینگر میں پائی۔ اُس کے بعد سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا اور پنجاب یُونیورسٹی میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اِس کے بعد آپ نے الٰہ آباد یُونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈِگری حاصل کی۔

سرینگر واپس آتے ہی آپ نے محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز میں مُلازمت اختیار کی جو آپ کو راس نہ آئی اور مُلازمت سے مستعفی ہو گئے۔ سیاست اور اخبار نویسی میں دِلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۴۰ء میں آپ سرینگر سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "کشمیر ٹائمز" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مُقرّر ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں آپ نے سرینگر سے ایک اعلٰے معیار کا انگریزی ہفت روزہ "کشمیر سینٹی نل" جاری کیا۔ زُتشی صاحب

کے قلم میں بلا کا طنز تھا۔ آپ کا قلمی نام 'JAZZ' تھا اور وہ اسی نام سے متعدد اخبارات میں NUTS وغیرہ کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ زُتشی صاحب کا قول تھا کہ جب تک وہ روزانہ کوئی مضمون نہ لکھ لیں، ایسا محسوس ہوتا کہ کھانا ہی نہیں کھایا۔ بہر حال ۱۹۴۳ء میں آپ نے اِس اخبار کے جُملہ حقوق مولوی یوسف شاہ صاحب کے حق میں فروخت کر دئے۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب ریاست کے سابق وزیر اعلےٰ مرحُوم شیخ محمّد عبداللہ کشمیر کے مُسلمہ لیڈر بن چکے تھے اور اُنھوں نے مُسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل کر اِسکے دروازے ہر قوم و فرقہ کے لئے کھول دئے تھے۔ چنانچہ جانکی ناتھ زتشی بھی نیشنل کانفرنس میں دِلچسپی لینے لگے اور ۱۹۴۶ء میں "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے سِلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے۔

۱۹۴۷ء کے اخیر میں مرحُوم شیخ محمّد عبداللہ نے جب ہیڈ آف ایڈمنسٹریشن کا اور چند ماہ بعد پرائم منسٹر کا عہدہ سنبھالا تو اُس وقت ریاست کا محکمہ پبلسٹی نہایت کسمپرسی کی حالت میں تھا۔ قبائلی ریڈ کی وجہ سے ریاست میں ہر طرف افراتفری پھیل چُکی تھی۔ شیخ محمّد عبداللہ کشمیر کے رِوایتی بھائی چارے اور فرقہ وارانہ امن کا پرچار کر رہے تھے اور نیشنل کانفرنس کے سینکڑوں والنٹیر بھی مصروف کار تھے۔

پاکستان میں نشریات اور پبلسٹی کے اِنچارج ڈاکٹر محمّد دین تاثیر تھے جو گزشتہ جنگِ عظیم میں برطانوی ہند کے کونٹر پراپیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کے ایک اعلےٰ افسر رہ چُکے تھے اور اپنے فن میں ماہر مانے جاتے تھے۔

چنانچہ اِس کا مُقابلہ کرنے کیلئے شیخ صاحب نے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کو از سرِ نو منظم کیا۔ نئے محکمہ کا نام اِنفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ ڈیپارٹمنٹ رکھا گیا۔ جانکی ناتھ زُتشی اِسکے سیکریٹری اور راقم الحروف انڈر سیکریٹری تعینات ہوئے۔ یہ حکم جاری کرنے سے پہلے شیخ صاحب نے ہم دونوں کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور کہا کہ وہ ایک اہم کام کو ہمارے سپُرد کر رہے ہیں۔ جہاں ایک طرف فوج حملہ آوروں کا مُقابلہ کر رہی ہے دوسری طرف آپ کے محکمہ کو اُس اعصابی جنگ کا مُقابلہ کرنے کی ذِمّہ داری سونپ رہا ہوں۔ زُتشی صاحب نے بہ خوشی یہ ذِمّہ داری قبول کر لی۔

خوش قسمتی سے ریاست کے اُس نازک اور پُر آشوب زمانے میں ہندوستان کے پرائم منسٹر پنڈت جواہر لعل نہرو اور اِنفارمیشن و براڈ کاسٹنگ منسٹر سردار پٹیل ہماری ضروریات کو خوب سمجھتے تھے۔ اُن کے حکم سے جس سرعت کے ساتھ جموّں میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا وہ براڈ کاسٹنگ کی تاریخ میں ایک کارنامہ تھا۔

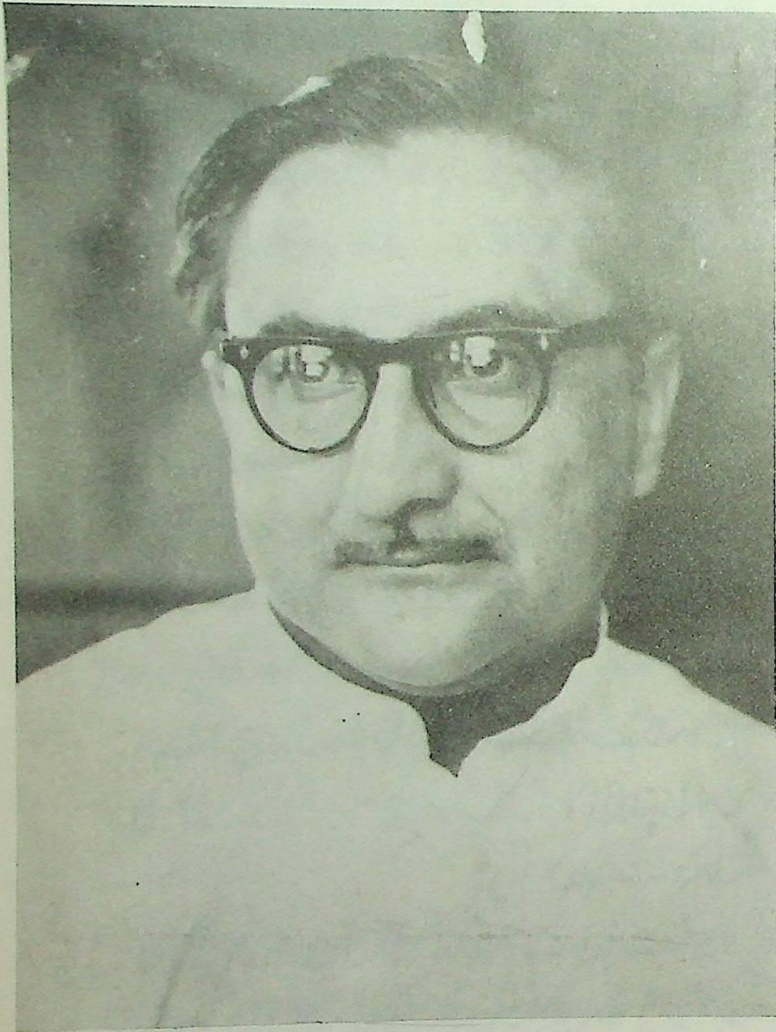
اپنی خداداد ذہانت کا زُتشی صاحب نے بھر پور اِستعمال کیا اور دِن رات کی محنت سے اِطلاعات اور نشریات کے صیغوں کو نئی ضروریات کیمطابق منظم کیا۔ جموّں و سرینگر کے علاوہ دہلی میں بھی اِنفارمیشن آفس قائم کیا گیا۔ چند ماہ کے اندر اندر ہی زُتشی صاحب نے کچھ پمفلٹ بھی بنائے جو انگریزی، اُردو اور ہندی زبانوں میں شائع کئے گئے۔ پوسٹر پبلسٹی کی بھی ایک زوردار مہم شروع کی گئی۔ کشمیر کی روائتی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے موضوع پر چند

ڈرامے لکھوائے گئے جنکو زیادہ تر دیہاتی علاقہ جات میں سٹیج کیا جاتا تھا۔ یہ ڈرامے بھی کافی مقبول ہوئے۔ کشمیر کے اہلِ قلم حضرات کی میٹنگیں مُنعقد کرکے انہیں اِس نازک دور میں اپنے جوہر دکھلانے کی تلقین کی۔

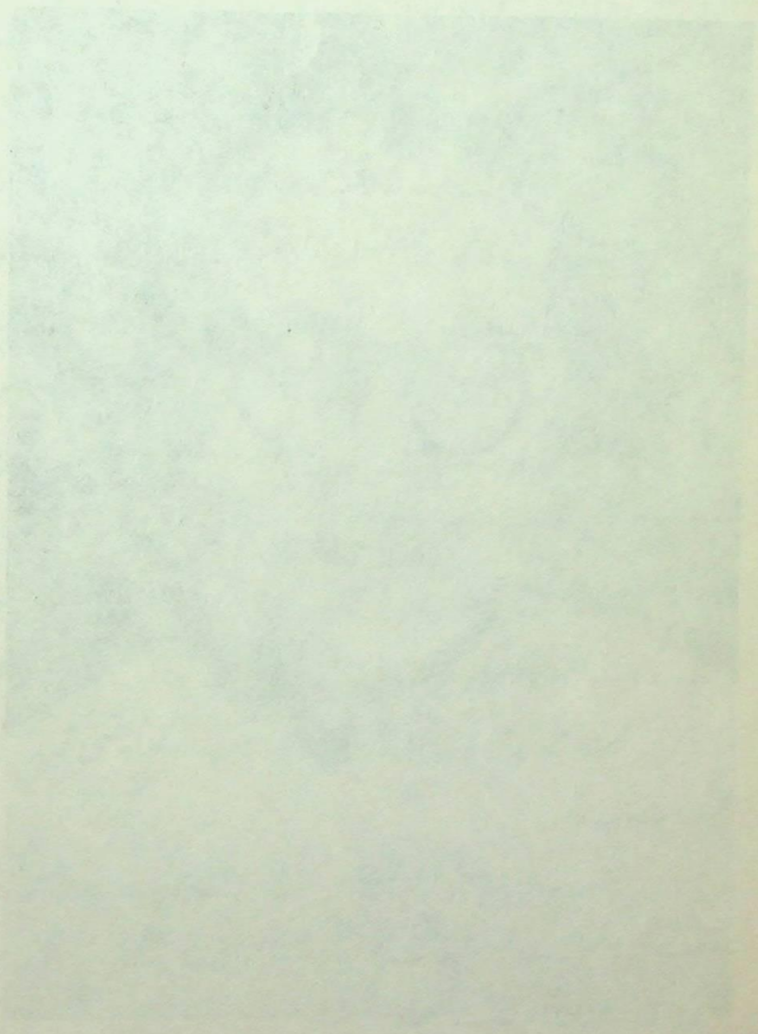
انہی دنوں پرائم منسٹر کشمیر کے دورہ پر آئے۔ شیخ صاحب، زتشی صاحب اور راقم الحروف کو بھی نشر و اشاعت کے مُعاملات میں ان سے بات چیت کرتے وقت ساتھ لے گئے۔ ہم نے اُس وقت تک شائع شُدہ تمام پمفلٹوں، پوسٹروں و کتابچوں کی کاپیاں پرائم منسٹر کو پیش کیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے اِس موقعہ پر زور دیکر کہا کہ جموں میں قائم کردہ ایک کلو واٹ پاور سٹیشن ریاست بھر کی اور خاص کر وادیٔ کشمیر کی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ نشریات کو زیادہ کارآمد اور موثر بنانے کے لئے سرینگر میں ریڈیو سٹیشن قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ زُتشی صاحب نے پرائم منسٹر کی توجہ اخباری کاغذ کی نایابی کی طرف دِلائی۔ آپ نے کہا کہ نیشنل کانفرنس کا اخبار "خدمت" بھی اتنی تعداد میں نہیں چھپ سکتا جتنی کہ اُسکی ضرورت ہے۔

پنڈت نہرو ہمارا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور واپس دہلی جاتے ہی اُنہوں نے سردار پٹیل کو ایک خط ۶ جون ۱۹۴۸ء کو لکھا جس کے دوران آپ نے لکھا:

"I have written to you about Kashmir already. I found that quite a good effort in the



جانکی ناتھ زُتشی



shape of propaganda has been made by the Kashmir Government. They have published attractive pamphlets and have very effective popular plays about the struggle, which are performed in large numbers in urban and rural areas. The difficulty is lack of paper and lack of broadcasting equipment....The only way is to have our own broadcasting. Therefore the urgency of this." شہ

(میں نے پہلے بھی کشمیر کے مُتعلق آپ کو لکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کشمیر گورنمنٹ نے موثر پراپیگنڈا کے سلسلہ میں اچھی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے خوبصورت پمفلٹ شائع کئے ہیں اور کشمیر کی جدوجہد کے متعلق مقبول عام اور موثر ڈرامے تیار کروائے ہیں جن کو دیہی اور شہری علاقوں میں دِکھلایا جارہا ہے۔ اُن کی مُشکلات میں کاغذ کی نایابی اور براڈ کاسٹنگ آلات کی کمی شامِل ہیں۔۔۔ایک ہی راستہ ہے کہ ہمارا اپنا براڈ کاسٹنگ کا اِنتظام ہو، اِس لئے اسکی اشد ضرورت ہے)

پنڈت نہرو کے اِس خط کا نتیجہ فوری طور سرینگر میں ریڈیو سٹیشن کا قیام تھا۔ یہ سٹیشن یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو چالو ہوا۔ یاد

شہ 'Sardar Patel's Correspondence' شائع کردہ نوجیون پبلشنگ ھاوس، احمد آباد صفحہ [illegible]

رہے کہ اس سے پہلے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو جموں میں ریڈیو سٹیشن چالو ہو چکا تھا۔ جنگی سطح پر اِن دونوں سٹیشنوں کو چالو کرنے کا سہرا آل انڈیا ریڈیو کے انجینیروں کے سر تھا۔ پروگراموں کی دیکھ بھال کے لئے بھی آل انڈیا ریڈیو کے چند افسران مامور کیئے گئے تھے۔ مگر اِن سٹیشنوں کا ایڈمنسٹریٹو کنٹرول ریاستی گورنمنٹ کے پاس تھا اِسلئے نشریاتی اداروں کو ریڈیو کشمیر کا نام دیا گیا۔

سرینگر سٹیشن سے "نیا کشمیر" کے عنوان سے ایک پروگرام روزانہ نشر ہوتے لگا جس کے ذریعہ عوام کو گورنمنٹ کے سیاسی اور اقتصادی پروگراموں کے متعلق باخبر رکھا جاتا تھا۔ دیہاتی آبادی کے لئے "عوامی راج زندہ باد" کے عنوان سے ایک پروگرام شروع کیا گیا۔ جموں سٹیشن سے 'نیا کشمیر زندہ باد' کے عنوان سے پروگرام جاری کیا گیا۔ اردو، کشمیری اور ڈوگری میں خبریں نشر کی جانے لگیں۔

ریڈیو سٹیشن سے نشریات ہی کافی نہ تھیں کیونکہ دیہاتوں میں تو ریڈیو سیٹ عوام کے پاس تھے ہی نہیں۔ اِس لیئے تُنشی صاحب کو دو بار دہلی جانا پڑا جہاں اُنہیں کامیابی ہوئی۔ کافی تعداد میں بیٹری سے چلنے والے سیٹ اور بجلی کی رو سے چلنے والے سیٹ جموں اور سرینگر لائے گئے۔ چنانچہ کمیونیٹی لسننگ Community Listening کا انتظام چلانے کیلئے جموں اور سرینگر میں فیلڈ پبلسٹی آفیسر مقرر کیئے گئے اور اِن کے ماتحت دیہاتوں میں لگائے گئے ریڈیو سیٹوں کی دیکھ بھال کرنے اور مفت میں نئی بیٹریاں پہونچانے کے لئے عملہ مقرر ہوا۔ پہلے سال ہی وادی کشمیر میں ۱۶۰ مقامات پر اور جموں میں

۵۷ مقامات پر ریڈیو سیٹ لگائے گئے اور اِس طرح دیہاتوں میں ریڈیو کشمیر کی نشریات سُننے کے لئے لوگ کافی تعداد میں اِن سنٹروں پر جمع ہونے لگے۔

اب چونکہ سری نگر میں بھی ریڈیو سٹیشن قائم ہو چکا تھا اِسلئے دونوں کے لئے ڈائریکٹر مُقرّر کئے گئے۔ اِنفارمیشن کے صیغہ کے سربراہ کا عہدہ "پرنسپل اِنفارمیشن آفیسر" بنایا گیا جس کے تحت جمّوں، دہلی اور سرینگر کے اِنفارمیشن آفس تھے۔ چونکہ شری جانکی ناتھ زُتشی دِن رات کی انتھک محنت سے اپنے ماتحت تمام اِداروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اِس لئے ڈایکٹر جنرل اِنفارمیشن و براڈکاسٹنگ کی اسامی بنائی گئی جس پر اُنہیں تعینات کیا گیا۔

یہ بتانا دِلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۹۴۸ء میں جب حکومت ہند نے کشمیر کا مُعاملہ سیکورٹی کونسل میں اُٹھایا تو ہندوستانی ڈیلیگیشن کے ایک ممبر کی حیثیت سے مرحُوم شیخ محمّد عبداللہ کو بھی وہاں بھیجا گیا۔ اس موقعہ پر زُتشی صاحب، شیخ صاحب کے ساتھ تھے۔ واپسی پر آپ نے شیخ صاحب کی تقریر کے متعلق، جو اُنہوں نے سیکورٹی کونسل کے سامنے کی تھی، ایک کتابچہ شائع کیا۔

۱۹۵۰ء میں جب شیخ صاحب دوبارہ امریکہ گئے اُس وقت بھی زُتشی صاحب اُن کے ساتھ تھے۔

امریکہ کی اپنی یاترا کی ڈائری میں شری جانکی ناتھ زُتشی نے بہت سے سنسنی خیز انکشافات کئے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ لیک سکسیس پہونچتے ہی

سب سے پہلے ہم نے برطانیہ کے نمائندہ سر فلپس
نویل بیکر (Sir Philips Noel Baker) سے
مُلاقات کی۔ سر گوپال سوامی آئنگر جو بھارت کے ڈیلیگیشن
کے لیڈر تھے، ہمارے ہمراہ تھے۔ برطانوی نمائندہ نے
بڑی حیران کُن بات کہی کہ کشمیر میں لڑائی کی شروعات
پاکستان نے نہیں بلکہ مہاراجہ کی افواج نے کی تھی۔ اِس
پر شیخ صاحب تیش میں آگئے اور اُنہوں نے جواًبا کہا کہ
برطانیہ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِس قسم کے بہتان
تراشے اور آزاد ہندوستان میں اپنے خفیہ ایجنٹ مقیم
رکھے۔ اِس پر سر فلپس اور شیخ محمد عبداللہ میں بہت
گرما گرم بحث ہوئی اور برطانوی نمائندہ نے شیخ صاحب
کو War Monger کہہ دیا۔ سر آئنگر نے یہ معاملہ
پنڈت نہرو کے نوٹس میں لایا جنہوں نے برطانیہ کے
پرائم منسٹر کو احتجاجی نوٹ بھیجا۔

اِس کے بعد ہم امریکہ کے نمائندہ وارن آسٹن (Warren
Austin) سے ملاقی ہوئے۔ اُس کا رویّہ بھی برطانیہ
کے نمائندہ کے رویّہ سے مختلف نہ تھا۔ اُس زمانہ میں
ایشیاء کے معاملات کو امریکہ برطانوی آنکھ سے دیکھا
کرتا تھا۔

تیسرا نمائندہ جس سے مُلاقات کی وہ فرانس کا تھا۔
اُس نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اِس معاملہ کا ذاتی

علم نہ ہونے کے کارن وہ برطانوی ڈیلیگیشن کی رائے
کے مُطابق چلے گا۔

اِس کے بعد ہم نے رُوسی ڈیلیگیشن کے لیڈر مسٹر
گرومیکو سے مُلاقات کی۔ گرومیکو سنجیدہ موڑ میں بیٹھا
تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ اُس سے بات کہاں سے
شروع کریں۔ مگر اُس نے شیخ صاحب سے خود ہی
ایک سوال پُوچھ کر ہمارا کام آسان بنا دیا۔ اُس نے
شیخ صاحب کو کہا کہ مختصر الفاظ میں موجودہ لڑائی کی
وجُوہات اور کشمیر کے واقعات بیان کر دیں۔ تقریباً
ایک گھنٹہ تک شیخ صاحب کی باتیں سُننے کے بعد
اُس نے پُوچھا "کیا وجہ ہے کہ آزادی حاصل ہو جانے
کے بعد بھی ہندوستان نے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہند کا
گورنر جنرل بنائے رکھا ہے اور اسی طرح ہندوستانی
افواج کا کمانڈر بھی ایک انگریز جنرل لوکارٹ ہی ہے۔"
گفتگو جاری رکھتے ہوئے گرومیکو نے کہا کہ کشمیر
کا جھگڑا برطانوی دولت مشترکہ کا اندرونی مُعاملہ ہی
معلوم پڑتا ہے۔ یہ جھگڑا بھی برطانیہ نے ہی پیدا کیا
ہے اور اُنہی کو چاہیئے کہ اسے کسی طرح ختم کریں مگر
چونکہ ہند نے یہ مُعاملہ اِس غرض سے سیکورٹی کونسل
میں لایا ہے کہ امن برقرار ہو اور موجودہ لڑائی کہیں
ہند اور پاکستان کے خلاف ایک باقاعدہ جنگ کی

شکل اختیار نہ کرنے پائے۔ ہم (روس) ایک پُر امن
حل تلاش کرنے میں مددگار ہوں گے۔ شیخ صاحب سے
اس بات چیت کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ روسی نمائندہ
نے مشورہ دیا کہ ہندوستانی ڈیلیگیشن کا لیڈر (سر
گوپال سوامی آئنگر) رسمی طور اُس سے بات چیت کرنے
کو آئے۔ بعد میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا
کہ ہند اور روس کے مابین خوشگوار دوستانہ تعلقات
شروع ہو گئے۔ اور جب جب اینگلو امریکن گروپ نے
ہند پر دباؤ ڈالکر مرعوب کرنے کی کوشش کی تب
تب روس نے مدد کی۔"[ے]

۹ اگست ۱۹۵۳ء کو جب ریاست میں سیاسی اُتھل پُتھل ہوئی اور شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے پرائم منسٹر کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا تو نئی گورنمنٹ نے شری جانکی ناتھ زُتشی کو بھی گرفتار کر کے سنٹرل جیل سرینگر میں نظر بند کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں زُتشی صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ اُس زمانہ میں بخشی وزارت نے اپنے پراپیگنڈا کے لئے ایک اخبار کی ضرورت کو محسوس کیا اور جموں سے ہفتہ وار انگریزی اخبار "کشمیر پوسٹ" شائع کیا۔ زُتشی صاحب اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔

۱۹۵۵ء میں زُتشی صاحب کو دوبارہ نظامت اطلاعات کا سربراہ بنایا گیا اور ساتھ ہی کنٹرولر سٹیشنری اور پرنٹنگ بھی۔ ۱۹۶۲ء

ے روزنامہ کشمیر ٹائمز۔ جموں ۱۹، اکتوبر ۱۹۸۲ء

میں آپ دہلی میں ریاست کے ٹریڈ کمشنر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں آپ پھر سے ڈائریکٹر انفارمیشن مقرر ہوئے اور اس کے بعد فیلڈ سروے آرگنائزیشن کا محکمہ بنا تو زُتشی صاحب ڈائریکٹر بنائے گئے۔ یہاں بھی زُتشی صاحب نے اخباروں کے ذریعہ پبلسٹی کو زیادہ اہمیت دی۔ ایک روزانہ انگریزی اخبار "نیوز" جاری کیا گیا۔ اس کے علاوہ سری نگر سے کشمیری زبان میں ایک ہفتہ وار اخبار "چمن" جاری کیا۔ جموں سے ڈوگری زبان کا ماہوار رسالہ "پھلواڑی" اور ہندی پندرہ روزہ "ڈگر سماچار" بھی جاری کئے گئے۔

۱۹۶۳ء میں ماسکو میں ہندوستانی صنعت وحرفت کی نمائش منعقد ہوئی جس میں کشمیر کی صنعت وحرفت کے نمونے بھی بھیجے گئے۔ جو ڈیلیگیشن کشمیر سے بھیجا گیا زُتشی صاحب اُس کی قیادت کر رہے تھے۔

۱۹۶۹ء میں زُتشی صاحب محکمہ مُردم شماری کے ڈائریکٹر مُقرر ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں سرکاری مُلازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں آپ کو حکومت کا پبلسٹی ایڈوائزر مُقرر کیا گیا۔ وہ ایک سال تک اِس عہدہ پر فائز رہے۔

۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۳ء میں زُتشی صاحب نے ذاتی خرچ پر امریکہ کا دورہ کیا لیکن وہاں بھی اُنہوں نے متعدد اخبارات میں کشمیر کے مُتعلق مضامین شائع کرائے۔

۶ دسمبر ۱۹۸۵ء کو زُتشی صاحب اِس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اُس وقت آپ کی عمر ۶۶ برس تھی۔

سعید احمد ڈار

حاجی عمرؔ ڈار

شمیم احمد شمیمؔ اور مولوی عبداللہ سے متعلق مضامین (مطبوعہ شخصیات نمبر "ہمارا ادب") میں حاجی عمر ڈار آسنور اور اُن کے فرزند خواجہ عبدالرحمٰن ڈار کا صاحبین مضامین نے بار بار ذکر کیا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا لوگ نہ معلوم کس کس طرح اور کن حالات میں دونوں کا ذکر آگے کرتے رہیں گے۔ بہتر ہے کہ حاجی عمر ڈار کے خاندان کا فرد ہونے کے ناطے میں قارئین "ہمارا ادب" کو صحیح حالات کی پیش کش کروں۔

دراصل ڈار خاندان آسنور کا نہیں بلکہ وریٹر شوپیان کا رہنے والا ہے۔ آسنور خواجہ محمد سبحان ڈار نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ محمد الدین فوقؔ تاریخ اقوام کشمیر میں "ڈار فیملی" "آسنور" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں کہ ڈار خاندان آسنور کے جد امجد محسن ڈار یا محی الدین ڈار تھے۔ وہ نہایت بزرگ اور روحانی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا مقبرہ وریٹر (شوپیان) میں مرجع خاص و عام ہے۔ ان کے فرزند عبدالکریم ڈار تھے جن کے ایک لڑکے محمد سبحان ڈار خانہ داماد بن کر نیاگوں کے یہاں آسنور چلے آئے۔ یہاں اُن کے دو بیٹے ہوئے ۔ حاجی عمر ڈار اور غلام رسول ڈار۔ حاجی عمر ڈار بھی مذہب کے معاملے میں ابتدا سے ہی تحقیق اور جستجو کے عادی تھے۔ سیبوں کی تجارت کے

سلسلہ میں چونکہ اُن کا سری نگر آنا جانا تھا اِس لئے وہ جمعہ کی نماز ہمیشہ جامع مسجد سرینگر میں پڑھا کرتے تھے۔ آسنور کا گاؤں آبشار اہربل کونگہ وٹن اور کوثر ناگ کے پہاڑی سلسلہ کے دامن میں واقع ہے۔ اُس زمانے میں گھوڑا اور خچر ہی سواری کا ذریعہ تھے۔ حاجی عمر ڈار آسنور سے گھوڑے یا خچر کی سواری پر سری نگر آتے جاتے تھے۔ میرواعظ خاندان کے مُریدوں میں سے تھے۔ جب عمر ڈار بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اُس وقت کے میرواعظ حضرت مولوی احمد اللہ صاحبؒ کے سامنے اپنے بڑھاپے اور دیگر عوارض کا ذکر کرنے کے بعد حضرت مولوی محمد حسین صاحب دیوبندی جو سرینگر کے محلہ بطخ پور کے رہنے والے تھے کا ذکر کیا۔ میرواعظ حضرت مولوی احمد اللہ صاحب نے عمر ڈار کو اجازت دیدی کہ وہ حضرت سید محمد حسینؒ کو آسنور لے جائیں۔ لیکن ساتھ یہ بھی ہدایت کی کہ حضرت مولوی محمد حسین شاہؒ زبردست موحد ہیں۔

حاجی عمر ڈار کی سرشت میں تحقیق اور جستجو کا مادہ بدرجہ اتم تھا۔ وہ فوراً حضرت مولوی سید محمد حسین شاہ صاحبؒ اور اُن کے چھوٹے بھائی مولوی سید محمد حسن شاہ صاحب کو آسنور لے آئے۔ یہاں سے حاجی عمر ڈار کی زندگی میں وہ انقلابات پیدا ہوئے جنہوں نے کشمیر کی سیاسی اور روحانی تاریخ میں ایک تلاطم پیدا کیا۔ حاجی عمر ڈار حنفی الاعتقاد مسلمان تھے۔ حضرت مولوی سید محمد حسین شاہؒ نے آتے ہی مسلک اہلحدیث کی تبلیغ شروع کر دی۔ غالباً سید صاحب موصوف کی پہلی شادی سرینگر میں ہوئی تھی۔ اس شادی کی اولاد میں سے شاید عبدالسلام صاحب پارمو زینہ کدل' ایک نواسے ہیں۔ دوسری شادی چھانہ پورہ شوپیان میں' تیسری آسنور میں اور چوتھی یاری پورہ میں کی تھی۔ حاجی عمر ڈار کو اس سے پہلے کشمیر کے سات "احمد" نامی بزرگوں سے واسطہ رہا تھا۔ احمد صاحب ترالی احمد

صاحب نیلی (یا احمد صاحب نیل بلی)، احمد صاحب تارہ بلی، احمد صاحب کانہامہ، احمد صاحب درگہ مولی، احمد صاحب ہایہ ہومی اور آخری احمد صاحب میر واعظ سری نگر۔ ان سات کے سات احمد صاحبان نے حاجی عمر ڈار کو اعتقاد کی جس لڑی کے ساتھ منسلک کیا تھا اگرچہ وہ آخری عمر تک اسی راہِ سلوک پر قائم رہے لیکن بیچ میں وہ خطرناک طور روحانی اور سیاسی لہروں کی لپیٹ میں آتے رہے۔ مولوی سید محمد حسین شاہؒ کی آمد سے عمر ڈار کو نہ صرف خاندان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ دیگر رشتہ داروں اور تاجر برادری کی شدید مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چونکہ تجارت اور زمینداری کی وجہ سے بے شمار لوگ حاجی صاحب کے مقروض تھے اس لئے یہ مخالفت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ آخر سید محمد حسین شاہؒ کی تحریک پر آپ منز گام کے ایک شخص گاشہ کوٹے کو لے کر حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔

حاجی صاحب کو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار میں سفید پوشی کی کرسی نشینی بھی حاصل تھی اور مولانا نورالدین کا، جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے شاہی حکیم تھے تعارف بھی حاصل تھا۔ سیالکوٹ میں محمد رمضان بٹ، جو دلوتن آمسنور سے ہجرت کر کے چلا گیا تھا، حاجی صاحب کا رشتہ دار تھا۔ بٹ صاحب کی اولاد ماسٹر تاج دین وغیرہ آج بھی سیالکوٹ میں اپنے حنفی مسلک پر قائم ہیں۔ جب حاجی صاحب سیالکوٹ پہنچے تو حج کے راستے بند ہونے کی وجہ سے عمر ڈار مکہ کے بدلے مولوی عبدالکریم سیالکوٹی اور حکیم نوردین کی مدد سے قادیان پہنچ گئے جہاں ۱۸۹۲ء میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ عمر ڈار صاحب کو اُس سال واپس آکر پھر ایک بار روحانی طور پر ایک دوسرے بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن اس دفعہ تجارتی، روحانی، سماجی اور سیاسی طور پر ایسی دراڑیں پڑیں کہ آج

تک جن کو نہیں پاٹا جا سکا۔ اور تو اور حضرت سید محمد حسین صاحبؒ کو پھر ایک دفعہ آسنور سے ہجرت کرنا پڑی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے دو بیٹے اور ایک بیٹی آسنور میں ہی رہ گئے۔ حاجی عمر ڈار اب کے پھر گاتش کو لے کو سے کر حج کرنے چلے گئے۔ ردگرد کے حاجی صاحبان نے آپ کے ساتھ نہ صرف یہ کہ کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ قادیانی ہونے کی وجہ سے عمر ڈار وہاں گرفتار بھی ہو گئے۔ اسی پریشانی میں اشرفیوں کی تھیلی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ مشکل سے رہائی ہوئی۔ واپس آکر جب ہر طرف سے حنفی الاعتقاد اور اہلِ حدیث رشتے داروں نے قطع تعلق کیا تو حاجی صاحب اور اُن کے تیسرے بیٹے خواجہ عبدالرحمٰن ڈار کو حالات میں اعتدال لانے کے لئے آخری موڑ (TWIST) دینا پڑا۔ یہ مولوی عبداللہ کی آسنور میں آمد تھی۔ آسنور حمید سنگھ، مان سنگھ، ناز سنگھ وغیرہ راجپوتوں کی جاگیر میں ایک گاؤں تھا۔ جس مقدمے کا ذکر خواجہ عبدالعزیز ایڈیٹر روشنی نے اپنے مضمون "مولوی عبداللہ" میں کیا ہے وہ مقدمہ آسنور کا ہی مشہور "ہتیا" مقدمہ تھا جس میں راجپوتوں نے بھینس کے ذبیحے کو گائے کا ذبیحہ قرار دے کر چالان کروایا تھا۔ بقول عبدالعزیز صاحب، اس زمانے میں کولگام میں عدالت نہیں "تحصیل" تھی۔ بہرحال سری نگر جا کر اپیلوں کے بعد مولوی عبداللہ اور دیگر وکلا کی مدد سے آسنور کے ڈاروں اور پٹھان خانوں کو رہائی ملی تھی۔ جب مولوی عبداللہ آسنور تشریف لائے تو راجپوت فوراً اُن سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ حاجی عمر ڈار، ڈار خاندان اور مولوی عبداللہ نے لوگوں کو راجپوتوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا، اور راجپوتوں نے ارد گرد کے ذیلداروں، نمبرداروں کی مدد سے ڈار خاندان (آسنور) اور مولوی عبداللہ کا ناک میں دم کر دیا۔ اسی دوران حاجی عمر ڈار کا انتقال ہو گیا اور کمان خواجہ عبدالرحمان ڈار نے باوجود کم سنی کے سنبھال لی۔ عقیدے کی تبدیلی کی وجہ سے

جو مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ رہا جیلوں کے خلاف بغاوت کے شور میں دب گیا۔

حاجی عمر ڈار صاحب زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ قرآن شریف، حدیث شریف اور دیگر مذہبی علوم میں بھی وہ غیر رسمی طور ہی تعلیم یافتہ تھے۔ اس لئے جہاں کہیں مذہب کی کوئی جھلک دیکھتے تھے فوراً اثر قبول کرتے تھے۔ وہ ۱۸۳۹ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے۔ جس طرح انہوں نے کشمیر کے سادات احمد صاحبان کا اثر قبول کیا اسی طرح بعد میں اہلحدیث مسلک سے بھی متاثر ہوئے اور مرزا غلام احمد قادیانی سے بھی۔ یہ تاثر شاہی حکیم جموں و کشمیر مولوی نور دین اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کی ترجمانی کا مرہون منت تھا۔

مرزا صاحب کے جانشین مرزا بشیر الدین محمود احمد مولوی نور دین کے زمانے میں ہی آسنور شاید دو دفعہ آئے۔ مولوی عبداللہ کے لاہوری کیمپ میں جانے کے باوجود ڈار فیملی اور ملک فیملی آسنور کے ساتھ سماجی، تجارتی اور آخر میں عدالتی اور سیاسی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ مولوی عبداللہ کو انتہائی بوکھلاہٹ کے عالم میں بہائی ہونا پڑا۔ ۱۹۲۹ء میں مرزا بشیر الدین محمود احمد نے مولوی عبداللہ کے ساتھ باضابطہ اپنی مبلغوں کی فوج کے ساتھ بہائیت پر مباحثے اور مناظرے کئے۔ عبدالعزیز صاحب (ایڈیٹر روشنی) بھی اپنے مضمون "مولوی عبداللہ" کے صفحہ ۱۹۲ پر مولوی صاحب کی بہائیت کی تصدیق کرتے ہیں اور صفحہ ۱۹۵ پر ان کی وفات کے وقت اُن کے مسلمان ہونے کو اُن کی اولاد کے ساتھ منسوب کرتے ہیں ؎ جو چاہے تیرا حسن کرشمہ ساز کرے۔

حاجی عمر ڈار صاحب ایک ایسی درمیانی چٹان تھے جس کے ساتھ قادیانیت، لاہوریت، بہائیت اور تحریک حریت آ کر ٹکرا گئی۔ حاجی صاحب اپنی فطری

سادگی، نیکی، خوشحالی اور سب سے بڑھ کر ڈپلومیسی سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے بالکل محفوظ رہے۔ قادیانی حضرات نے بڑی کوشش کی تھی ان کو لے جا کر قادیان میں دفن کر دیں کیوں کہ وہ مرزا صاحب کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ اس لئے از روئے آئین قادیانیت اُن کو مرزا صاحب کے پہلو میں جگہ ملنی تھی لیکن پھر وہاں کتبہ لگانے پر ہی اکتفا کیا گیا۔ خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار کو غلام محمد شاہ سابق وزیر اعلیٰ جو اس زمانے میں شوپیان کے سپیشل تحصیلدار تھے، نے گرفتار کروایا۔ معلوم ہوتا ہے خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار نے تجارتی، سیاسی، سماجی طور شدید ہزیمتوں کے بعد اس سب پر نظر ثانی کی تھی۔ؔ

یہ بات صاف کرنا بہت ضروری ہے کہ حاجی عمر ڈار اور مولوی عبداللہ نے مل کر جو تحریک چلائی تھی وہ قطعاً ناکام ہوگئی۔ مولوی عبداللہ کے سارے بچے اسلام میں واپس آگئے ہیں ماسوائے مشتاق احمد کے۔ میں نے خواجہ عبدالرحمان ڈار کے بڑے لڑکے کے اوّل فرزند کی حیثیت سے 'وا انکشاف' اعلان کیا کہ ہم ہر محاذ پر پٹ گئے۔ میرے خاندان والے لاکھ سانپ کے جانے کے بعد لکیر کو پیٹتے رہے لیکن ہمارا خاندان سیاسی سماجی، تجارتی، مذہبی اور دیگر محاذوں پر قطعاً ناکام ہو چکا ہے۔ اور تو اور جس سکول میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے مولوی عبداللہ اور خواجہ عبدالرحمان ڈار جیسے مجاہدین آزادی نے تعلیم حاصل کی اُس کو کوئی درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔

ؔ کیوں کہ ۱۹۴۷ء میں سنٹرل جیل سے بیرول پر رہائی کے بعد انہوں نے ایک تاریخی تقریر آسنور میں کی تھی۔ سب سے بڑھ کر ان کے داماد خواجہ محمد عبداللہ یونی عربی ٹیچر سری رنبیر سنگھ ہائی اسکول، کو توی پل پر بے وردی کے ساتھ قتل کرنے' اُن کے بیٹے مبارک احمد ڈار کی جدائی نے جس انداز سے اُن کو ایک صدی پر پھیلی ہوئی اس دردناک کہانی کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی سوجھی تھی وہ کہانی یہی سہی۔

جو مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ راجپوتوں کے خلاف بغاوت کے شور میں دب گیا۔

حاجی عمر ڈار صاحب زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ قرآن شریف، حدیث شریف اور دیگر مذہبی علوم میں بھی وہ غیر رسمی طور ہی تعلیم یافتہ تھے۔ اس لئے جہاں بھی مذہب کی کوئی جھلک دیکھتے تھے فوراً اثر قبول کرتے تھے۔ وہ ۱۸۳۹ء میں کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے۔ جس طرح انہوں نے کشمیر کے سادات احمد صاحبان کا اثر قبول کیا اسی طرح بعد میں اہل حدیث مسلک سے بھی متاثر ہوتے اور مرزا غلام احمد قادیانی سے بھی۔ یہ تاثر شاہی حکیم جموں و کشمیر مولوی نورالدین اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کی ترجمانی کا مرہونِ منت تھا۔

مرزا صاحب کے جانشین مرزا بشیرالدین محمود احمد مولوی نورالدین کے زمانے میں ہی آسنور شاید دو دفعہ آئے۔ مولوی عبداللہ کے لاہوری کیمپ میں جانے کے باوجود ڈار فیملی اور ملک فیملی آسنور کے ساتھ سماجی، تجارتی اور آخر میں عدالتی اور سیاسی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے لیکن آہستہ آہستہ مولوی عبداللہ کو انتہائی بوکھلاہٹ کے عالم میں بہائی ہونا پڑا۔ ۱۹۲۹ء میں مرزا بشیرالدین محمود احمد نے مولوی عبداللہ کے ساتھ باضابطہ اپنی مبلغوں کی فوج کے ساتھ بہائیت پر مباحثے اور مناظرے کئے۔ عبدالعزیز صاحب (ایڈیٹر روشنی) بھی اپنے مضمون "مولوی عبداللہ" کے صفحہ ۱۹۲ پر مولوی صاحب کی بہائیت کی تصدیق کرتے ہیں اور صفحہ ۱۹۵ پر ان کی وفات کے وقت اُن کے مسلمان ہونے کو اُن کی اولاد کے ساتھ منسوب کرتے ہیں ؎ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

حاجی عمر ڈار صاحب ایک ایسی درمیانی چٹان تھے جس کے ساتھ قادیانیت، لاہوریت، بہائیت اور تحریک حریت آکر ٹکرا گئی۔ حاجی صاحب اپنی فطری

سادگی، نیکی، خوشحالی اور سب سے بڑھ کر ڈپلومیسی سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے بالکل محفوظ رہے ہے۔ قادیانی حضرات نے بڑی کوشش کی تھی ان کو لے جاکر قادیان میں دفن کر دیں کیوں کہ وہ مرزا صاحب کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ اس لئے ازروئے آئین قادیانیت اُن کو مرزا صاحب کے پہلو میں جگہ ملنی تھی لیکن پھر وہاں کتبہ لگانے پر ہی اکتفا کیا گیا۔ خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار کو غلام محمد شاہ سابق وزیر اعلیٰ جو اس زمانے میں شوپیان کے سپیشل تحصیلدار تھے، نے گرفتار کروایا۔ معلوم ہوتا ہے خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار نے تجارتی، سیاسی، سماجی طور شدید ہزیمتوں کے بعد اس سب پر نظر ثانی کی تھی۔ٔ

یہ بات صاف کرنا بہت ضروری ہے کہ حاجی عمر ڈار اور مولوی عبداللہ نے مل کر جو تحریک چلائی تھی وہ قطعاً ناکام ہوگئی۔ مولوی عبداللہ کے سارے بچے اسلام میں واپس آگئے ہیں ماسوائے مشتاق احمد کے۔ میں نے خواجہ عبدالرحمان ڈار کے بڑے لڑکے کے اول فرزند کی حیثیت سے 'وانشگاف' اعلان کیا کہ ہم ہر محاذ پر پٹ گئے۔ میرے خاندان والے لاکھ سانپ کے جانے کے بعد لکیر کو پیٹتے رہے لیکن ہمارا خاندان سیاسی، سماجی، تجارتی، مذہبی اور دیگر محاذوں پر قطعاً ناکام ہو چکا ہے۔ اور تو اور جس سکول میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے مولوی عبداللہ اور خواجہ عبدالرحمان ڈار جیسے مجاہدین آزادی نے تعلیم حاصل کی اس کو کوئی درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔

ؒ کیوں کہ ۱۹۴۷ء میں سنٹرل جیل سے پیرول پر رہائی کے بعد انہوں نے ایک تاریخی تقریر آسنور میں کی تھی۔ سب سے بڑھ کر ان کے داماد خواجہ محمد عبداللہ یونؔ عربی ٹیچر سری رنبیر سنگھ ہائی اسکول، کو توی پل پر بے دردی کے ساتھ قتل کرنے' ان کے بیٹے مبارک احمد ڈار کی جدائی نے جس انداز سے اُن کو ایک صدی پر پھیلی ہوئی اس دردناک کہانی کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی سوجھی تھی وہ کہانی یہ سہی۔

ریکارڈ کی درستی کے لیئے یہ کہنا ضروری ہے کہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے مضمون "مولوی عبداللہ" میں آخر پر فٹ نوٹ میں محمودہ بیگم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی ایک سے زیادہ شادیاں ہوئی ہیں، یہ بات غلط ہے کہ شادی اس نے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد صرف ایک کی ہے۔ اس سے پہلے اپنے ماموں زاد بھائی بریگیڈیر قیوم خان (ریٹائرڈ) حال سینیٹر (ساکن ماتو شوپیان) کے ساتھ صرف منگنی ہوئی تھی۔ اور ایک قادیانی مولوی کے ہاتھوں ایبٹ آباد میں نکاح خوانی کے جھگڑے پر یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ بعد میں بریگیڈیر قیوم خان نے مولوی عبدالرحیم کی بیٹی کے ساتھ شادی کی جن سے ان کا ایک لڑکا احسن خان ہے۔ عبدالعزیز صاحب نے مولوی عبداللہ کے بیٹوں کی نافرمانی کا جو قصہ لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ مولوی عبداللہ کے سب بیٹے ان کی دل و جان سے خدمت کرتے تھے لیکن مذہب کے معاملے میں وہ سب آخر پھر ہادیٔ برحق کی چوکھٹ پر واپس آگئے تھے ماسوائے مشتاق احمد کے۔ بریگیڈیر قیوم خان، حال سینیٹر بھی قادیانی نہ رہے اور مسلمانوں کے سواد اعظم میں شامل ہو کر مہاجروں خصوصاً کشمیری مہاجرین کے لیئے مثبت رول ادا کیا۔ محمد ایوب صابر المعروف ایم اے صابر کراچی میں سوسائٹی قبرستان میں دفن ہیں۔ ڈاکٹر ہارون رشید لاہور میں ریلوے ہسپتال میں ایک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ مولوی بشیر نے کوئی شادی نہیں کی تھی۔ وہ بحیثیت یونیو کمشنر کنوارے ہی فوت ہو گئے ہیں۔ مولوی عبدالرحیم کے سب بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ لاہوری سیکٹ کے ساتھ اُن کا اب دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے ماسوائے اس کے کہ خواجہ کمال الدین کا خاندان اُن کے ننھیال کا خاندان ہے۔ مولوی عبداللہ بھی لون خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شخصیات نمبر میں ایک دوسرے مضمون میں اُنکو "شال" لکھا گیا ہے۔ "شال" اُن کی جرٹ تھی اور مولوی خطاب۔ اصل

میں وہ لون تھے، جس کو وہ اب پاکستان میں "ریتہ" کے نام سے بدل رہے ہیں اور اپنا نام راجپوتوں میں درج کر رہے ہیں۔ ذاتوں کا کیا ہے یہ تو صرف پہچان کے لئے ہیں —●



کلچرل اکادمی

کی مطبوعات کے علاوہ

مُلک بھر کے نامور علمی اِداروں کی مطبوعات

خریدنے کے لئے تشریف لائیے



مولانا آزاد روڈ

سرینگر

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر